تاریخ کیا کہتی ہے

ڈاکٹر مبارک علی
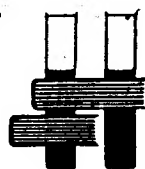
نام کتاب = تاریخ کیا کہتی ہے؟
مصنف = ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18 مزنگ روڈ لاہور فون 7237430 ' 7249218
پروڈکشن = ظہور احمد خاں' رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = اے - این - اے پرنٹرز لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1998ء
قیمت = 90 روپے

انتساب

اپنے دوست اقبال خاں (وفات 28 اپریل 1993ء)

کے نام

فہرست

تاثرات

ان مضامین کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ تاریخ کے مفہوم کو تنگ نظری اور گھٹن سے نکال کر ایک وسیع نقطہ نظر سے پیش کیا جائے۔ ہمارے معاشرے میں جو ذہنی پس ماندگی اور دوسروں کے لئے جو نفرت ہے اس کی بنیاد ہمارا گمراہ کن تاریخی شعور ہے۔ جب تک ہم اپنی تاریخ کو تنقیدی نقطہ نظر سے نہیں دیکھیں گے اور اس کے تقدس کو پارہ پارہ نہیں کریں گے اس وقت تک ہمارا ذہن آزاد نہیں ہو سکے گا۔ ہمارے ملک میں اس آزادی کی راہیں مسدود ہیں۔ کیونکہ کوئی راستہ ایسا نہیں کہ جو ہمیں اس حصار سے نکالے اور ہمارا معاشرہ دیکھ سکے کہ اس کے ارد گرد کی دنیا بڑی وسیع اور پھیلی ہوئی ہے۔ خوبصورتی اور سچائی ہر طرف بکھری ہوئی ہے' اس لئے اس کی قدر کرنا اور اس کی عزت و احترام کرنا ہمارا کام ہے۔ نفرت قوموں کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ وسیع القلبی اور رواداری قوموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتی اور انہیں پروان چڑھاتی ہے۔ آیئے اس تنگنائے سے نکلنے کی راہیں تاریخ میں تلاش کریں۔

مبارک علی

لاہور'

جون 1993ء

ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج و زوال
(جدید تحقیق)

برصغیر کی تاریخ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارتی اور سیاسی اقتدار تاریخ کا ایک انتہائی اہم باب ہے۔ اس لئے اس تجزیہ کی ضرورت ہے کہ کمپنی کن حالات میں پیدا ہوئی اور کس عمل کے تحت اس نے برصغیر میں تجارتی اور سیاسی اقتدار حاصل کیا اور کن وجوہات کی بناء پر وہ برصغیر میں اقتدار کی مالک ہوئی۔ اور پھر وہ کون سے حالات تھے کہ اس کا تسلط ختم ہوا اور اس کی جگہ ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت ہو گیا؟ کیا کمپنی کا دور حکومت برصغیر کے لئے باعث رحمت رہا، یا اس نے ہندوستان کی توانائی و قوت کو کھوکھلا کر کے اسے پس ماندہ بنا دیا؟

اس سلسلہ میں کمپنی کے کردار کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیکھا گیا ہے۔ برطانوی مورخوں نے اس نقطہ نظر کو پیش کیا ہے کہ ابتداء میں یعنی 1600ء سے کمپنی بیرونی تاجروں کا ایک ادارہ تھی اور اس کا مقصد سوائے تجارت کے اور کچھ نہیں تھا۔ مگر بعد میں ہندوستان کے حالات نے اسے مجبور کیا کہ وہ سیاست میں دخل اندازی کرے اور تجارتی مفادات کے تحفظ کے لئے سیاست کا سہارا لے۔ 1757ء میں جب اس کو بنگال میں فتح ہو جاتی ہے تو اس کے سیاسی عزائم بڑھ جاتے ہیں اور پھر وہ اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دیتی ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے دو پروفیسروں گالا گھر اور رابنسن' نے برطانوی امپیریل ازم کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ برطانیہ کو سیاسی اقتدار کی کوئی خواہش نہیں تھی' یہ حالات تھے کہ جنہوں نے برطانوی اہل اقتدار کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فتوحات کریں' اس لئے ہندوستان میں اگر کمپنی نے سیاست میں دخل دیا' اقتدار کے لئے جنگیں لڑیں' یہاں کی سازشوں میں حصہ لیا' جھوٹے معاہدے کئے' اور دھوکہ دہی میں ملوث ہوئی' تو اس کی وجہ ہندوستان کے حالات اور یہاں کی سیاست کی خرابی تھی۔ برطانوی مورخوں کا کہنا ہے کہ کمپنی نے ہمیشہ ہندوستانی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے کام کیا اور اگر ایسی کوئی مثالیں ہیں کہ جن میں کمپنی کے ملازمین رشوت اور بدعنوانی میں ملوث ہوئے؛ تو ان کو مستثنیات سمجھنا چاہئے۔ کمپنی نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک مثبت کردار ادا کیا ہے اور ہندوستان جو سیاسی طور پر ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا اسے متحد کر کے اسے ایک

سیاسی وحدت دی۔ یہاں جو سیاسی ابتری تھی اس کو ختم کر کے امن و امان قائم کیا۔ اور لاقانونیت کو ختم کر کے یہاں پر قانون کی حکمرانی قائم کی۔

برصغیر کے مورخوں نے اس نقطہ نظر کو چیلنج کیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اورنگ زیب کے بعد کے زمانہ کو جو زوال کا عہد سمجھا جاتا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ دور سیاسی ابتلاء اور انتشار کا دور تو ہو سکتا ہے کہ جس میں معاشرہ سماجی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا مگر معاشی طور پر ہندوستانی معاشرہ زوال پذیر نہیں ہوا تھا' بلکہ اس عہد میں معاشی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ خود مختار صوبیداروں اور جاگیرداروں کی سرپرستی میں صوبائی شہروں میں بازار اور گنج قائم ہو رہے تھے کہ یہاں پورے ملک اور بیرونی ملکوں سے تجارتی مال وافر مقدار میں آتا تھا' جس کی وجہ سے ہندوستانی دست کار و کاریگر اور صنعت کار پیداوار کو بڑھانے میں مصروف تھے۔ خصوصیت کے ساتھ کپڑے کی صنعت میں ہندوستان انتہائی ترقی یافتہ تھا۔ اگر ہندوستان کی یہ معاشی سرگرمیاں جاری رہتیں اور ان میں کوئی رکاوٹ نہ آتی تو ہندوستان جاگیردارانہ دور سے نکل کر سرمایہ داری کے زمانہ میں داخل ہو جاتا' کیونکہ اس کے معاشی نظام میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں اور اس میں جو صلاحیتیں پنہاں تھیں وہ اس تبدیلی کے عمل کو تیز کر رہی تھیں۔ مگر اس عمل کو کمپنی کے سیاسی اقتدار نے روک دیا۔ ابتداء ہی سے کمپنی کے مفادات یہ تھے کہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس لئے سیاسی اقتدار میں آنے کے بعد اس نے ہندوستان کی معاشی ترقی کو روک کر اسے ایک پس ماندہ ملک بنا دیا کمپنی کی حکومت ہندوستان کے لئے ایک المیہ ثابت ہوئی کہ جس نے اس کی ترقی اور اس کی صلاحیتوں کو ختم کر دیا۔

ہندوستان کے ایک مشہور مورخ رام کرشن مکرجی نے برصغیر میں "ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج و زوال" کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور اس میں انہوں نے برطانوی مورخین کے نقطہ نظر کو دلائل کے ساتھ رد کیا ہے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج کو مرکنٹائل سرمایہ داری نظام سے اور اس کے زوال کو صنعتی سرمایہ داری کی ابتداء قرار دیتا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کیسے وجود میں آئی؟ اس نے انگلستان کی تاریخ کا سماجی اور سیاسی تجزیہ کیا ہے اور اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ انگریز معاشرے میں اس وقت معاشرتی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں جب وہاں پیوریٹن ازم کا عروج ہوا اور اس کی سرپرستی میں تاجر طبقہ آگے بڑھنا شروع ہوا۔ اس طبقہ کے عروج کی دو علامتیں تھیں۔ ایک شہروں کی آبادی کا بڑھنا' اور دوسرے کاریگروں کا گلڈ کے تحت متحد ہونا۔ ابتداء میں تاجر طبقہ کی بنیاد محدود ذرائع

پیداوار پر تھی۔ کاریگر جو کچھ پیدا کرتا تھا' اس آمدنی سے وہ اپنے خاندان کی کفالت کر سکتا تھا مگر اس کے پاس زائد سرمایہ جمع نہیں ہو پاتا تھا' کہ جس کی بنیاد پر وہ ملازم رکھ کر ان کی محنت سے اپنی پیداوار کو بڑھاتا۔ ان حالات میں جاگیردار طبقہ سماجی اور معاشی حیثیت سے بہت مستحکم رہا۔

معاشرتی ڈھانچہ میں تبدیلی اس وقت آئی جب کاریگروں کے طبقے میں پیداواری عمل کو ایک ایک شعوری منصوبے کے تحت روک دیا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں ایک محدود گروہ پیدا ہوا جو کہ "ہول سیل" کا کاروبار کرنے لگا' یہ کاریگروں کا تیار شدہ سامان لے کر اسے فروخت کرتا۔ اس طبقہ کا تعلق پیداوار سے بالکل نہیں تھا۔ کاریگر اور تاجر کی سماجی حیثیت بھی ایک تھی' دونوں گلڈ کے رکن ہوتے تھے اور کاریگر تاجر و تاجر کاریگر بنتا رہتا تھا۔ یہ صورت حال چودھویں صدی تک رہی۔ بعد میں صورت حال اس طرح سے بدلی کہ کاریگروں میں سے جو کہ خوش حال تھے انہوں نے پیداوار سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور اپنی علیحدہ سے تجارتی جماعتیں بنا لیں اور کسی خاص پیداوار میں تجارت شروع کر دی۔ زائد مالی آمدن نے ان کے سماجی مرتبہ کو کاریگروں کے مقابلہ میں بڑھا دیا' اس لئے انہوں نے کاریگروں کو نکال کر علیحدہ سے اپنی گلڈ بنا لی' اس کے نتیجہ میں مرکنٹائل طبقہ پیدا ہوا جس نے خاص خاص پیداوار میں مہارت حاصل کر کے اس میں تجارت شروع کر دی' ان حالات میں کاریگر کی مساوی حیثیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ اس کا ماتحت ہو گیا۔

اس کے بعد سے تاجر طبقہ نے اپنے اثر و رسوخ کو پھیلانے کا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے شہروں کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا کہ اس کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرے۔ شہر کی میونسپلٹی اور دوسرے اداروں پر قبضہ کے بعد انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ پارلیمنٹ میں اپنے اثر کو بڑھایا جائے۔ معاشرہ کی یہ سماجی اور معاشی تبدیلیاں قانون' رسم و رواج' اور روایات میں بھی تبدیلیاں لے کر آئیں۔ سود جسے اب تک چرچ حرام کہتا تھا' اسے تجارتی طبقہ کے مفاد میں مشہور عیسائی ریفارمر کالون نے (1564ء) جائز قرار دے دیا۔ انگلستان کی پارلیمنٹ میں 1552ء کے ایک قانون میں سود کو برا کہا گیا تھا۔ مگر بعد میں یہ قانون تاجروں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے واپس لے لیا گیا۔

انگلستان کے تاجروں کے سرمایہ میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب انہوں نے اون کی تجارت پر کہ جس پر اب تک اطالویوں اور فلنڈرز (FLANDERS) کا قبضہ تھا' اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی' کیونکہ اون کی صنعت وہ واحد صنعت تھی کہ جو دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی تھی' اس کے منافع سے وہ اس قابل ہوئے کہ اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کریں اور تجارت کو

فروغ دیں۔ یہ وہ حالات تھے کہ جن میں 1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔

اس وقت دستور یہ تھا کہ تجارتی کمپنیوں کو رایل چارٹر دے دیا جاتا تھا کہ جس کے تحت وہ خاص خاص ملکوں میں تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیتی تھیں۔ ان ملکوں میں دوسری کمپنیوں کو تجارت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس چارٹر کے ذریعہ انہیں یہ بھی آزادی تھی کہ وہ اپنے علاقہ میں نظم و نسق قائم کریں' قوانین بنائیں' اور فوجی طاقت کو استعمال کریں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام مرکنٹائل سرمایہ داری نظام میں عمل میں آیا۔ اس نظام کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سرمایہ پیداوار میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ سرمایہ کاریگروں کے تیار شدہ مال اور اس کے خریدنے والوں کے درمیان استعمال ہوتا تھا۔ ایک جگہ سے سستا مال خریدتے تھے اور دوسری جگہ اسے منافع کے ساتھ مہنگا فروخت کرتے تھے۔ اس لئے اس نظام میں تاجروں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایسی ملکی و غیر ملکی منڈیاں جہاں سے وہ سستا مال خرید سکتے تھے وہاں پر انکی اجارہ داری ہو اور کوئی دوسرا ان کے منافع میں شریک نہ ہو۔ اس دور میں جتنی تجارتی کمپنیاں قائم ہوئیں انہوں نے خاص ملکوں اور علاقوں کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اور رایل چارٹر کے ذریعہ دوسری تجارتی کمپنیوں کو ان علاقوں کی تجارت سے خارج کروا دیا۔ لیکن برطانوی تجارتی کمپنیوں کو دوسری قوموں کی کمپنیوں سے بہرحال مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جن میں پرتگیزی' ڈچ اور فرانسیسی قابل ذکر تھے۔ اس لئے تجارتی منڈیوں کے حصول کے لئے ان یورپی اقوام میں زبردست سیاسی کش مکش شروع ہوئی۔ جن میں سمندروں میں ایک دوسرے کے جہاز اور سامان کو لوٹنا اور ایک دوسرے کا قتل عام کرنا عام واقعات تھے' اس لئے تجارت اور قزاقی میں بہت کم فرق ہوا کرتا تھا۔

یورپی اقوام کی کوشش یہ تھی کہ سمندر میں نئے راستوں کو تلاش کیا جائے تاکہ وہ جلد اور محفوظ طریقے سے ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں جا سکیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ دوسری اقوام ان راستوں کو استعمال نہ کر سکیں۔ اس کو روکنے کے لئے انہوں نے راستے میں جنگی اہمیت کے جزیروں میں مضبوط قلعے تعمیر کئے تھے تاکہ ان راستوں سے گزرنے والے جہازوں کو روکا جا سکے اور ان کے سامان کو لوٹا جا سکے۔ اس طرح مرکنٹائل سرمایہ داری کی بنیاد جغرافیائی راستوں کی تلاش' تجارتی اجارہ داری' غلاموں کی خرید و فروخت' اور سمندری قزاقی پر تھی۔ اور اس نظام میں سرمایہ داری کا تعلق پیداوار سے بالکل نہیں ہوتا تھا' مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے جو سامان خریدتی تھی اس کی قیمت وہ چاندی کی شکل میں ادا کرتی تھی۔ یہ چاندی وہ افریقی غلاموں کو جزائر غرب الہند اور ہسپانوی امریکہ میں بیچ کر حاصل کرتی تھی۔

انگلستان اس وقت تک صنعتی لحاظ سے ایک پس ماندہ ملک تھا' اور اس کی صرف اون کی صنعت تھی کہ جس کی مانگ ہندوستان میں نہیں تھی۔ اس لئے وہ ہندوستان سے سامان لے جاتے تھے اور اس کے بدلہ میں وہ کچھ لاتے نہیں تھے۔

تجارتی کمپنیوں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ جس ملک میں تجارت کرنا چاہتے تھے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہاں کے حکمرانوں سے خوشامد' رشوت' اور دوسرے ذرائع سے زیادہ مراعات حاصل کریں۔ جس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں آئی تو اس وقت پرتگیسزی اور ڈچ یہاں پہلے سے موجود تھے' خصوصیت سے پرتگیسزی' کہ جنہوں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور مغل بادشاہ و امراء سے اچھے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ اس لئے ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو مراعات حاصل کرنے کے لئے سخت محنت کرنا پڑی۔ کیپٹن ہاکنس اور ٹامس رو' دو انگریز جو مغل دربار میں آئے' انہوں نے کمپنی کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرنے کی سخت کوشش کی۔ ان مراعات میں سب سے اہم یہ ہوا کرتی تھیں کہ کمپنی جو سامان خریدے اس پر سے کسٹم ڈیوٹی معاف کر دی جائے۔ تاکہ وہ سستے داموں خرید کر اس مال کو مہنگے نرخوں پر یورپ کی منڈیوں میں فروخت کر سکیں۔ مغل حکومت جب تک مضبوط اور مستحکم رہی کمپنی کے ملازمین خوشامد اور تحفہ تحائف دے کر اپنے مقاصد حاصل کرتے رہے۔ مگر ابتداء ہی سے کمپنی کے سیاسی عزائم تھے کیونکہ انہیں اس کا اندازہ تھا کہ سیاسی قوت کے بعد وہ اس قابل ہو سکیں گے کہ سستا مال اپنی شرائط پر خریدیں اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کریں۔ اس لئے کمپنی پرامن تاجروں کا ادارہ نہیں تھی' بلکہ یہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے پرتشدد راستہ اختیار کرنے پر تیار تھی۔ اس پس منظر میں کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی کا سیاسی اقتدار محض نجی مہم جوئی' انفرادی بہادری و شجاعت پر نہیں تھا' اور نہ ہی ان کی فتح میں برطانوی قوم کا کوئی وراثتی جذبہ تھا' بلکہ اس کی فتوحات کی وجوہات مرکنٹائل سرمایہ داری اور اس کی سماجی و معاشی اور سیاسی قوتیں تھیں کہ جنہوں نے اس کی فتح کی راہوں کو متعین کیا۔

یورپی تجارتی کمپنیاں ساحلی علاقوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرتی تھیں جو فیکٹری کہلاتی تھیں۔ اس سے ان کی دو ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ ایک یہ کہ اندرون ملک سے جو مال خرید کر لایا جاتا تھا' اسے یہاں اسٹور کیا جاتا تھا اور جہازوں کے آنے پر اسے یورپ روانہ کیا جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ اگر اس علاقہ کا گورنر یا حکمران ان کے خلاف کوئی کارروائی کرتا تو یہ بھاگ کر ساحل پر لنگر انداز جہازوں میں پناہ لے لیتے تھے۔ چونکہ سمندر پر ان کی اجارہ داری تھی'

اس لئے یہ اپنے خلاف فوجی کاروائی سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس کی مثال سراج الدولہ کا فورٹ ولیم پر حملہ ہے کہ جس میں شکست کھا کر انہوں نے کلکتہ کے ساحل پر لنگر انداز جہاز میں پناہ لی تھی۔ حالات کے ٹھیک ہونے' اور معاہدہ کے بعد یہ واپس اپنی فیکٹری میں آ جاتے تھے۔

انکی یہ تجارتی کوٹھیاں ابتداء میں تو صرف مال کے گودام ہوا کرتے تھے' مگر بعد میں انہوں نے ان کو قلعوں میں تبدیل کر دیا اور اس کا جواز یہ دیا کہ یہ مال و اسباب کی حفاظت کے لئے ضروری تھا۔ اس کے بعد انہوں نے قلعہ کی حفاظت کے لئے باقاعدہ فوج بھی رکھنی شروع کر دی اور اس طرح سے ان کی تجارتی کوٹھیاں جگہ جگہ قلعوں میں تبدیل ہو گئیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے 1612ء میں سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کی جو بعد میں اس کا ہیڈ کوارٹر بن گئی۔ فیکٹری کا نظم و نسق چلانے والا صدر کہلاتا تھا اور اس کے ماتحت جو کام کرتے تھے ان میں "فیکٹر" خصوصیت سے قابل ذکر تھے' کیونکہ یہ فیکٹر تھے جو اندرون ملک اہم تجارتی شہروں میں جایا کرتے تھے اور وہاں سے تجارتی سامان خریدتے تھے۔ جس میں کپڑا' نیل اور گرم مصالحہ قابل ذکر تھے۔ پہلے یہ سامان اندرون ملک کی تجارتی کوٹھیوں میں جمع ہوتا' اس کے بعد اسے سورت لایا جاتا اور پھر یہاں سے جہازوں میں بھر کر اسے یورپ روانہ کیا جاتا تھا۔

اس تجارت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو زبردست منافع ہوا۔ منافع کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی تجارت پر اس کی اجارہ داری تھی اور یہ اجارہ داری وہ انگلستان کی حکومت اور اس کے عہدے داروں کو رشوتیں دے کر برقرار رکھے ہوئے تھی۔ تجارت کے منافع اور سرمایہ میں اضافہ کی وجہ سے انہوں نے آہستہ آہستہ ہندوستان میں پرتگیزی اثر و رسوخ کو کم کرنا شروع کر دیا' اور 1638ء کے بعد سے تو انہوں نے پرتگیزی کمپنی کے بہت سے تجارتی علاقے ان سے چھین لئے۔ سندھ میں پرتگیزی بڑے طاقت ور تھے اب ان کی جگہ انگریز آگئے اور 1635ء میں انہوں نے ٹھٹھہ میں اپنی پہلی فیکٹری قائم کر لی۔ اسی طرح ڈچ اور فرانسیسی ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکے اور 1769ء میں انہوں نے ان سب کو شکست دے کر ہندوستان میں اپنا سیاسی و تجارتی اقتدار قائم کر لیا۔

اس پس منظر کے بعد رام کرشن مکرجی نے ہندوستان کی سماجی و معاشی حالت کا تجزیہ کیا ہے کہ جس وقت یورپ میں سیاسی و سماجی تبدیلیاں آ رہیں تھیں' اس وقت ہندوستان تاریخ کے کس عمل سے گزر رہا تھا اور وہ کون سی وجوہات تھیں کہ کمپنی کو یہاں کامیابی ہوئی؟ اور پھر

سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کمپنی کی آمد اور اس کے اقتدار نے ہندوستان کی ترقی کے عمل کو تیز تر کیا یا اس عمل کو روک دیا' اور جس کے نتیجہ میں ہندوستانی معاشرہ پس ماندہ ہو کر رہ گیا۔ کارل مارکس نے ہندوستانی معاشرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس معاشرہ میں گاؤں کا ڈھانچہ جن بنیادوں پر قائم تھا اس نے ہندوستان کو منجمد معاشرہ میں تبدیل کر دیا' کیونکہ گاؤں بذات خود ایک ایسا سماجی و معاشی اور سیاسی یونٹ تھا کہ جس میں زندگی ٹھہری ہوئی تھی۔ یہاں پر کاشتکار اجتماعی طور پر زمین کاشت کرتے تھے اور حکومت کو اس کا لگان ادا کرتے تھے۔ گاؤں کی آبادی کی بنیادی ضروریات گاؤں کا لوہار' موچی' جولاہا اور برہمن پوری کر دیتا تھا۔ ذات پات کی تقسیم' اور مختلف پیشوں کا ان ذاتوں سے تعلق ہونے کے بعد کسی شخص کو اپنے سماجی مرتبہ کو بدلنے کا خیال تک نہیں آتا تھا' اس لئے گاؤں کا معاشرہ اور اس کا ڈھانچہ منجمد ہو کر رہ گئے جس نے ترقی کے عمل کو روک دیا۔

اس نقطہ نظر کے برعکس ہندوستان کی تاریخ پر جو جدید تحقیق ہوئی ہے اس میں اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ ہندوستان کے معاشرہ کو منجمد اور ٹھہرا ہوا سمجھنا ٹھیک نہیں' کیونکہ ترکوں' افغانوں' اور مغلوں کی فتوحات نے ہندوستان کے معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں کی تھیں۔ ان کی حکومتوں کے قیام کے بعد جب یہاں مضبوط مرکزی حکومت قائم ہوئی تو اس نے گاؤں کا روایتی ڈھانچہ توڑ دیا۔ اسی دور میں بھگتی تحریک نے معاشرے کے سماجی ڈھانچہ کے خلاف ایک زبردست عوامی تحریک کی ابتداء کی۔

جدید تحقیق کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہندوستان کا جاگیرداری نظام مغرب سے بالکل مختلف تھا کہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار زمینوں کے موروثی مالک ہوتے تھے۔ ان جاگیروں پر مضبوط قلعے ہوا کرتے تھے جہاں ان کی فوجیں رہا کرتی تھیں۔ جائداد کو محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ تھا کہ خاندان کا بڑا لڑکا وارث ہوتا تھا۔ ان جاگیردار خاندانوں نے یورپ میں بادشاہ کو مطلق العنان نہیں ہونے دیا اور اس کی طاقت کو برابر چیلنج کرتے رہے۔ بارود کی ایجاد کے بعد جب ان کے قلعے محفوظ نہیں رہے تو ان کی طاقت ٹوٹی۔ انگلستان میں پارلیمنٹ کا ادارہ برابر اپنی طاقت و اختیارات کو بڑھانے کی جدوجہد کرتا رہا اور بادشاہ کے اختیارات کو برابر چھینتا رہا۔ جس نے بادشاہ کو کمزور کیا اور پارلیمنٹ کو بااختیار بنایا۔

ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام نہ موروثی تھا اور نہ ہی یہاں کے جاگیردار اتنے طاقتور تھے کہ وہ بادشاہ کے اختیارات کو چیلنج کر سکتے۔ زمین گاؤں کی مشترک ملکیت ہوتی تھی۔ بادشاہ جب کسی کو جاگیر دیتا تھا تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ وہ اس جاگیر سے ایک مقررہ لگان وصول کرے۔

امراء کی یہ جاگیریں بدلتی رہتی تھیں اس لئے وہ اپنا اثر و رسوخ ایک علاقے میں قائم نہیں کر سکتے تھے۔ گاؤں کے لوگ اپنا لگان ادا کرنے کے بعد اپنے معاملات میں خود مختار تھے۔ جب مسلمان حکمران خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت قائم کی اور مرکزی انتظامیہ کو طاقتور بنایا تو انہوں نے گاؤں کی خود مختار حیثیت کو بھی کمزور کیا' مثلاً علاؤالدین خلجی نے جو زرعی اصلاحات نافذ کیں ان کے ذریعہ اس نے گاؤں کے چودھری' مقدم' اور خوط کی تمام آمدن کو لے لیا۔ اس نے حکومت کا 50% حصہ مقرر کیا' جو اس قدر زیادہ تھا کہ اس کے ادا کرنے کے بعد ان کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔ علاؤالدین اس طریقہ سے ان کی طاقت کو کمزور کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس قابل نہ رہیں کہ اس کے خلاف بغاوت کر سکیں۔

شیر شاہ سوری نے ایک انقلابی تبدیلی کی۔ اب تک مقدم اور چودھری گاؤں کی پنچایت کے سامنے جوابدہ ہوا کرتے تھے' اس نے انہیں سرکاری ملازم بنا لیا جس کے بعد سے یہ مرکزی حکومت کے سامنے جوابدہ ہونے لگے۔ اس نے ان کی خود مختاری کو ختم کر دیا۔ شیر شاہ کے اس نظام کو اکبر نے مکمل کیا جس کے بعد سے حکومت اور کسانوں کے درمیان براہ راست رابطہ ہو گیا۔ گاؤں جو اب تک علیحدہ تھا اس کی علیحدگی ٹوٹ گئی اور وہ مرکزی انتظامیہ سے منسلک ہو گیا۔

اس سیاسی و انتظامی تبدیلی کے ساتھ ساتھ' ذات پات اور سماجی اونچ نیچ کے خلاف بھگتی تحریک شروع ہوئی جس نے پندرھویں اور سولھویں صدی میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ یہ ایک عوامی تحریک تھی کہ جس میں کاریگر' درزی' جولاہے' موچی' حجام اور بھنگی شامل تھے۔ اس تحریک نے ذات پات کی سختیوں کے خلاف احتجاج کیا اور نجات کا راستہ انسان اور الٰہی قوتوں کو قرار دیا۔

ان سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے نتیجہ میں ہندوستان میں تاجر طبقہ پیدا ہوا۔ اس طبقہ کی ترقی کی علامتیں ہندوستان میں نئے نئے شہروں کا قیام تھا' جن میں فیروز آباد' حصار' فتح آباد' فیروز پور' بدایوں' جون پور' اور پٹنہ مشہور شہر تھے۔

تجارت کو مزید فروغ شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی سڑکوں اور سرایوں سے ہوا۔ اس نے ان راستوں کو انتہائی محفوظ بنا دیا جس کی وجہ سے تاجر آسانی کے ساتھ تجارتی سامان ملک کے کونے کونے میں پہنچانے لگے۔ اس کی وجہ سے صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی۔ جب مال کی مانگ منڈیوں میں بڑھی تو پیداوار میں اضافہ ہوا۔ پیداوار کے اضافے نے غیر ملکی تجارت کو ترقی دی۔ حکومت نے تاجروں کی سرپرستی کی اور شاہی خاندان کے افراد اور امراء نے نہ صرف

تجارت میں سرمایہ کاری کی' بلکہ تاجروں کی ہمت افزائی بھی کی۔
تجارت کے فروغ کے لئے حکومت نے باقاعدہ محکمہ قائم کیا' جس کا انچارج شحنہ منڈی کہلاتا تھا۔ جب اکبر نے پورے ملک میں مہر' روپیہ' اور دام کی ایک کرنسی کو نافذ کر دیا تو اس سے تجارت کو اور زیادہ فروغ ہوا۔ اس نے ہندوستان میں مرکنٹائل سرمایہ کو پیدا کیا۔ ہندوستان کے تاجر کاریگروں سے سامان تیار کراتے اور پھر اسے منافع کے ساتھ ملکی اور غیر ملکی منڈیوں میں فروخت کرتے۔ اس طرح سے حکومت کی سرپرستی' مذہبی رواداری' نئے شہروں کے قیام' سڑکوں و سرایوں کی تعمیر' امن و امان اور حفاظتی انتظامات کی وجہ سے تاجر طبقہ نے تجارت میں نفع حاصل کیا اور خوب سرمایہ جمع کیا۔
اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان اور یورپ میں معاشی اور سماجی عمل میں یکسانیت تھی۔ دونوں جگہوں پر جاگیرداری کا نظام کمزور ہو رہا تھا۔ اور تاجر طبقہ تیزی سے ترقی کر رہا تھا' جس کی سرپرستی حکومتیں کر رہی تھیں۔ مرکنٹائل سرمایہ داری دونوں جگہ فروغ پا رہی تھی مگر اس یکسانیت کے باوجود دونوں میں گہرا فرق تھا۔ ہندوستان ایک وسیع ملک تھا جس کی وجہ سے اس کا ساحلی علاقہ دور تھا۔ اس لئے یہاں حکومتوں نے بحری طاقت کی طرف توجہ نہیں دی اور سمندروں میں ان کا اثر و رسوخ نہیں بڑھ سکا' یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی تاجر سمندر پار ملکوں میں تجارت کو زیادہ فروغ نہیں دے سکے اور ان کا دائرہ کار اندرون ملک کی منڈیوں تک محدود رہا۔ اس کے مقابلہ میں انگلستان ایک چھوٹا ملک تھا' سمندر اس کے قریب تھا' اس لئے تجارت کے لئے انہیں سمندری راستوں کو استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی بحری طاقت کو بڑھائیں۔
ہندوستان کا تاجر طبقہ یورپی تاجروں کی طرح جاگیرداری کو کمزور نہیں کر سکا اور اپنی علیحدہ حیثیت سے وہ طاقت ور بن کر نہیں ابھر سکا' اس لئے جب یورپی اقوام ہندوستان میں آئیں تو یہاں کے تاجر طبقہ نے انہیں خوش آمدید کہا' کیونکہ ان کے آنے سے انہیں دو فائدے ہوئے۔ ان کے جہازوں کے ذریعہ انہوں نے اپنا مال غیر ملکوں میں بھیجنا شروع کر دیا' دوسرے انہوں نے ان کے اور ہندوستانی کاریگروں کے درمیان دلال کا کام کیا' اور ان کی مانگ پر سامان تیار کرا کے انہیں فراہم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی تاجر ابتداء ہی سے یورپی تاجروں کا محتاج ہو کر رہ گیا اور اس کی حیثیت ان کے طفیلی کی ہو کر رہ گئی اور جلد ہی یورپی تاجران کی ضرورت بن گئے۔ اس وجہ سے ان کی یہ خواہش تھی اور یہ ان کے مفاد میں تھا کہ یورپی تاجر ہندوستان میں رہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ فائدے اٹھاتے رہیں۔ یہی وہ ذہنیت تھی کہ 1757ء

میں پلاسی کی جنگ میں ہندوستانی تاجر طبقہ نے کمپنی کا ساتھ دیا' ان میں جگت سنگھ' اور امی چند قابل ذکر ہیں۔

یورپی تاجروں نے بہت جلد اس بات کا اندازہ کر لیا کہ ہندوستانی حکمران چونکہ بحری طاقت نہیں رکھتے اس لئے وہ اپنے ساحلی علاقوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے اور سمندروں میں ان کا کوئی اثر نہیں۔ اس کمزوری نے ان کی ہمتیں بڑھا دیں اور انہوں نے سمندر پر اپنا مکمل تسلط قائم کر لیا۔ پرتگیزیوں نے اپنا تسلط اس قدر مستحکم کر لیا تھا کہ کوئی جہاز ان کے ویزے کے بغیر سمندر میں جا نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے گوا کے جزیرے پر قبضہ کر کے اسے اپنے مشرقی علاقوں کا مرکز بنا لیا اور کوشش کی کہ دوسری یورپی اقوام کو ہندوستان میں تجارت نہ کرنے دیں۔ چونکہ پرتگیزی مذہبی طور پر بڑے متشدد تھے اور لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانا چاہتے تھے' اس لئے لوگ ان کے مظالم کی وجہ سے ان سے بیزار ہو گئے' اسی وجہ سے شاہ جہاں نے بنگال میں ان کے خلاف سخت اقدامات کئے۔

اس لئے جب انگریز یہاں آئے تو مغل حکومت اور تاجروں نے انہیں خوش آمدید کہا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی وجہ سے پرتگیزیوں کا زور ٹوٹ جائے گا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے انگریز تاجروں کو تجارتی مراعات دیں۔ آخری عہد مغلیہ میں جب انگریز دوسری یورپی اقوام کے مقابلہ میں طاقت ور ہو چکے تھے' انہیں فرخ سیر کے عہد میں 1716ء' 1717ء میں ایک فرمان کے تحت کسٹم ڈیوٹی سے معافی دے دی گئی جس کی وجہ سے کمپنی کو تجارت میں زبردست فائدہ ہوا اور حکومت کی آمدنی گھٹ جانے سے اس کے خزانہ میں کمی آئی۔ خصوصیت سے بنگال کی آمدنی اس رعایت سے گھٹ گئی۔ یہی وہ وجوہات تھیں کہ سراج الدولہ نے کمپنی کے خلاف اقدامات کئے اور کوشش کی کہ کمپنی کو 1717ء والی حیثیت میں لے آئے۔ کیونکہ اس رعایت سے جہاں ایک طرف خزانہ میں کمی آئی وہاں ہندوستانی تاجروں کو سخت نقصان پہنچا کیونکہ انہیں اپنے مال پر کسٹم ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس سے بچنے کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ کمپنی کو رشوت دے کر اپنا مال ان کے ساتھ بھجوانا شروع کر دیا' اس کا فائدہ بھی کمپنی کو ہوا۔

کمپنی کے ابتداء ہی سے ہندوستان میں سیاسی عزائم تھے' کیونکہ انہیں اس کا اندازہ تھا کہ اب تک وہ تجارتی مراعات جو خوشامد اور رشوت کے ذریعہ حاصل کر رہی ہے' سیاسی اقتدار کے بعد وہ طاقت کے ذریعہ حاصل کر سکے گی۔ انہوں نے اپنی طاقت کا پہلا مظاہرہ اورنگ زیب کے زمانے میں 1686ء میں کیا' مگر اس وقت تک مغل حکومت طاقت ور تھی' اس لئے انہیں

شکست ہوئی، جس کے نتیجہ میں اس کے ملازمین کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کی تجارت بند کر دی گئی۔ لیکن بہت جلد دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ کیونکہ ایک طرف کمپنی کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ طاقت کے ذریعہ نہیں بلکہ صرف مفاہمت کے ذریعہ زندہ رہ سکتی ہے، دوسرے مغل حکومت کی کمزوری یہ تھی کہ جنگ کی صورت میں حج کے سمندری راستے محفوظ نہیں رہتے تھے اور تجارت بند ہونے سے خزانہ کی آمدن کم ہو گئی تھی۔ یہ جنگ ہندوستانی تاجروں کے مفاد میں بھی نہیں تھی، اس لئے 1690ء میں مغل حکومت اور کمپنی میں مصالحت ہو گئی۔

لیکن جب مغل حکومت کمزور ہوئی، اور اس میں زوال کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے تو اس سے کمپنی نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تخت کے دعویداروں کے جھگڑوں میں انہوں نے کسی ایک فریق کی مدد کر کے اس سے مراعات حاصل کیں۔ اس طرح انہوں نے اول جنوبی ہندوستان میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا اور پھر 1757ء کی پلاسی جنگ کے بعد وہ بنگال میں سیاسی قوت کے مالک بن بیٹھے۔ بکسر کی جنگ کے بعد تو مغل بادشاہ بھی ان کے زیر اثر آگیا۔ اس کے بعد سے انہوں نے آہستہ آہستہ پورے ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کر لیا اور یوں ان کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔

سیاسی اقتدار کے بعد کمپنی کی حیثیت مضبوط ہو گئی۔ اب اسے تجارتی مراعات کے لئے کسی کی خوشامد کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ یہ اس کے دائرہ اقتدار میں تھا کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ تجارتی فوائد حاصل کئے جائیں۔ اس لئے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کے کاریگر کسی اور کو اپنا مال فروخت نہ کریں، اور یہ مال صرف کمپنی کے ہاتھوں بیچیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی ان سے یہ مال اپنی مرضی کی قیمت پر خریدتی تھی جو کہ بہت کم ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد دوسرا کام کمپنی نے یہ کیا کہ ہندوستانی کاریگروں کو اپنی فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ ان سے وہ صرف وہ مال تیار کراتے تھے جس کی مانگ یورپ کی منڈیوں میں ہوتی تھی۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہندوستان کے معاشی ڈھانچہ میں زبردست تبدیلی آئی۔ ہندوستانی کاریگر جو اب تک آزادی کے ساتھ اپنے گھروں یا کارخانوں میں کام کرتے تھے، اب وہ کمپنی کے ملازم ہو گئے۔ اور کام کے عوض انہیں تنخواہ ملنے لگی جس کی وجہ سے ان کی آمدن کم ہو گئی اور انہیں اپنی محنت سے جو لگاؤ تھا وہ ختم ہو گیا۔ ہندوستان کے تاجر بھی اس سے متاثر ہوئے، کیونکہ انہیں کاریگروں سے مال ملنا بند ہو گیا، اس لئے ان کی تجارت بھی ختم ہو گئی، صرف وہ تاجر باقی بچے جو کمپنی کے لئے کام کرتے تھے، اس سے ہندوستان میں بیروزگاری میں زبردست اضافہ کیا۔

کمپنی نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے مال پر کسٹم ڈیوٹی اور دوسرے تمام ٹیکس ختم کر دیئے' اس نے ہندوستانی تاجروں کو مزید نقصان پہنچایا۔ کمپنی کے ملازم بھی چونکہ نجی تجارت کرتے تھے' اس لئے انہوں نے اس مراعت سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔ میر قاسم جب بنگال کا نواب ہوا تو اس نے اسی چیز کو دیکھتے ہوئے تمام تاجروں پر سے کسٹم ڈیوٹی ختم کر دی جس کی وجہ سے کمپنی اس سے ناراض ہو گئی اور اسے بنگال کی نوابی سے دستبردار ہونا پڑا۔

کمپنی کی اس پالیسی کے نتیجہ میں بنگال خصوصیت سے متاثر ہوا' اس کی روایتی صنعت و حرفت تباہ ہو گئی' بے روزگاری میں اضافہ ہوا اور پیداوار کی کمی نے اس سرزمین کو قحط' بھوک اور افلاس کی سرزمین بنا دیا۔

وارن ہیسٹنگ جب گورنر جنرل ہوا تو کمپنی کے سیاسی عزائم بہت بڑھ چکے تھے' اس لئے اس نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے یہاں کے قانون' زبان اور تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے قوانین ترتیب دیئے گئے' ہندو قانون دھرم شاستروں کے مطابق لکھوائے اور مسلمانوں کے قرآن و حدیث کے مطابق ہدایہ کے نام سے قوانین جمع کئے گئے۔ اس نے ہندوستان میں رجعت پرست قوتوں کو فروغ دیا ورنہ کمپنی کی حکومت سے پہلے یہاں ترقی پسند قوتیں ہندو مسلم اتحاد کے فروغ کے لئے کام کر رہیں تھیں۔ اس پالیسی نے اس اتحاد کو روک دیا۔ ہندو مسلم اختلافات کو ابھار کر ایک طرف دونوں میں دوری پیدا کی تو دوسری طرف مذہبی بنیاد پرستی اور احیاء کی تحریکوں کو فروغ دیا۔ ان مذہبی قوانین کے تحت وہ تمام مذہبی رسومات جو کہ معاشرے کو پس ماندگی کی طرف لے جاتی تھیں' انہیں دوبارہ سے زندہ کیا گیا۔ مثلاً اکبر کے زمانہ میں ستی' کم عمری کی شادی اور بیواؤں کی شادی کی مخالفت کو ختم کرنے کی کوششیں ہوئیں تھیں' جب راجہ رام موہن رائے نے ان رسومات کے خلاف احتجاج کیا تو کمپنی کی حکومت نے ان کی بات نہیں مانی۔ مشہور مورخ ولسن نے اس بات پر زور دیا کہ ستی کی رسم ہندوؤں کی مذہبی رسم ہے لہٰذا اسے جاری رہنا چاہئے۔ اس کے نتیجہ میں کمپنی کے ابتدائی دور حکومت میں پورے مغل عہد سے زیادہ عورتیں ستی ہوئیں۔ مذہبی قوانین کے احیاء نے ایک طرف ذات پات کی تقسیم کو گہرا کیا تو دوسری جانب اس کی وجہ سے برہمنوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔

یہی صورت مسلمانوں میں ہوئی کہ کمپنی نے مسلمان علماء کو ملازمتیں دے کر انہیں اہم عہدوں پر رکھا' اور ان کے ذریعہ مسلمان معاشرے میں رجعت پسند قوتوں کو آگے بڑھایا۔

مذہبی جذبات کے اس ابھار نے ہندو مسلم اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

دائمی ریونیو کے نظام کو قائم کرنے کے بعد کمپنی نے ہندوستان میں موروثی جاگیرداروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا جو ان کا وفادار تھا۔ اس طبقہ نے پورے برطانوی دور حکومت میں نہ صرف ان کی حمایت کی بلکہ اپنے ہم وطنوں کی ہر قومی تحریک کو کچلنے اور ختم کرنے میں ان کی مدد کی۔ جاگیردارانہ نظام کو مضبوط بنا کر کمپنی نے ہندوستان کے صنعتی طبقے کو جو ابھر رہا تھا' اسے روک دیا' اور ملک ایک بار پھر پس ماندگی کی طرف چلا گیا۔

ہندوستان کے مورخوں نے کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کی نشاندہی کی ہے۔ کمپنی کے ملازمین نے سیاسی اقتدار کے بعد رشوت' تحفہ تحائف' نجی تجارت اور ٹیکسوں کے ذریعہ ہندوستان کو بری طرح لوٹا کھسوٹا۔ جب کمپنی کے یہ ملازم یہ دولت لے کر واپس انگلستان گئے تو انہوں نے وہاں "نوابوں" کا ایک طبقہ پیدا کیا جنہوں نے اس دولت کے بل بوتے پر جائدادیں خریدیں اور پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ چونکہ کمپنی کی بنیاد مرکنٹائل سرمایہ داری پر تھی اس لئے اس کے ملازم جاگیردارانہ نظام سے متاثر تھے اور وہ اس طبقہ میں شمولیت اختیار کر کے اپنا سماجی رتبہ بڑھانا چاہتے تھے۔ اس طرح حالات کی تبدیلی میں یہ طبقہ ترقی پسند قوتوں کا ساتھ نہیں دے سکا اور رجعت پرست بن گیا۔

پلاسی کی جنگ کے بعد جو دولت انگلستان میں گئی اس نے وہاں صنعتی انقلاب کو تیز کیا۔ 1760ء سے انگلستان میں صنعتی ترقی میں تیزی آئی اور نئی نئی ایجادات ہونے لگیں جنہوں نے ذرائع پیداوار کو تبدیل کر دیا۔ بقول بروکس ایڈم' ایجادات بذات خود کچھ نہیں ہوتیں جب تک کہ انہیں استعمال نہیں کیا جائے اور انہیں اسی وقت استعمال کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے لئے ذرائع ہوں' ورنہ یہ ایجادات صدیوں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ ہندوستان کی دولت نے انگلستان کی ایجادات کے استعمال کے لئے ذرائع فراہم کئے جس کی وجہ سے صنعتی ترقی میں اضافہ ہوا۔ جب انگلستان میں کپڑے کی صنعت کو ترقی ہوئی' تو کپڑے کی ملوں کے مالکوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستانی کپڑے پر بھاری ڈیوٹی لگائی جائے' اور آخر میں تو انہوں نے اس کی فروخت اور استعمال پر پابندی لگوا دی۔

انگلستان کا صنعتی انقلاب جو کہ اٹھارویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں مکمل ہو گیا تھا' اس نے صنعتی سرمایہ دار کو طاقت ور بنایا۔ یہ طبقہ کمپنی کی اجارہ داری کا سخت مخالف تھا' کیونکہ انہیں اپنی پیداوار کے لئے منڈیوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے حالات کا تقاضہ تھا کہ مرکنٹائل سرمایہ داری کو تبدیل کیا جائے۔ کیونکہ صنعتی سرمایہ داری میں منافع اشیاء کی پیداوار

کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا' اس لئے انہوں نے آزاد تجارت پر زور دیا اور ان کی حمایت میں آدم اسمتھ (1776ء) نے اپنے معاشی نظریات پیش کئے جن میں کمپنی کی زبردست مخالفت کی گئی۔

اس دباؤ کے تحت 1817ء میں ایک چارٹر کے ذریعہ کمپنی کی اجارہ داری ہندوستانی تجارت سے ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد سے یہ ہوا کہ ہندوستان اب تک جو دنیا بھر کو کپڑا فراہم کرتا تھا' اس کی صنعت تباہ ہو گئی اور اب اس کی منڈیوں میں انگلستان کا بنا ہوا کپڑا فروخت ہونے لگا۔

1857ء کے ہنگامہ کے بعد انگلستان کی پارلیمنٹ کہ جس میں صنعتی سرمایہ دار طبقہ کا اثر و رسوخ ہو گیا تھا اس نے کمپنی کی حکومت کی سخت مخالفت کی' اور آخر کار ہندوستان میں اس کی حکومت کا خاتمہ کرا کے اسے براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت کر دیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان کی منڈیاں انگلستان کے صنعت کاروں کے لئے کھل گئیں۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی کا عروج مرکنٹائل سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ہوا اور اس کا زوال صنعتی سرمایہ داری کی ابتداء سے ہوا۔

اردو زبان کا طبقاتی کردار

اردو زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پہلے اس زبان کا وجود نہیں تھا اور جب مسلمان آئے تو انہوں نے اس زبان کی داغ بیل ڈالی۔ زبانوں کی تشکیل اس طرح سے اچانک نہیں ہوتی' ان کا وجود پہلے سے موجود ہوتا ہے اور نئے لوگوں کے اشتراک سے ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ الفاظ کے معنی بدلتے رہتے ہیں اور الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ عربی' فارسی' اور ترکی زبانوں کو لائے اور مقامی قوموں کے اشتراک کے نتیجہ میں ان زبانوں کے بہت سے الفاظ ہندوستان کی زبانوں میں داخل ہوئے۔ اس اشتراک کے نتیجہ میں زبانوں کی ہیئت و شکل ضرور بدلی۔ مگر زبانوں کی بنیاد اپنی جگہ موجود رہی۔ اس لئے اردو زبان ہندوستان میں کوئی نئی زبان نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے جو کہ بقول حافظ محمود شیرانی دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔(1)

شمالی ہندوستان میں جب مسلمان حکمران خاندانوں نے اپنی سلطنت قائم کی تو دربار کی زبان فارسی تھی' جب کہ ہندوستان کے عوام فارسی سے ناواقف تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اور حکمران طبقوں میں دوری ہوتی چلی گئی۔ فارسی زبان کی حیثیت اس وجہ سے برابر مستحکم ہوتی چلی گئی کہ وسط ایشیا اور ایران سے مسلسل نئے لوگ آتے رہے جو نہ صرف حکمران طبقوں کو مضبوط کرتے تھے بلکہ یہ زبان کو بھی توانائی اور نئی زندگی دیتے تھے اور ہندوستان کا ثقافتی رشتہ ایران سے مستحکم کرتے تھے۔

انتظامی امور اور سلطنت کے معاملات تو فارسی زبان میں ہو جاتے تھے مگر جب عام لوگوں سے بات چیت ہوتی اور ان سے کاروباری معاملات طے ہوتے تو پھر مقامی بولیوں اور زبانوں کو وسیلہ بنانا پڑتا تھا اس لئے سماجی و معاشرتی رابطہ کے نتیجہ میں زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے میں داخل ہوئے۔

ترکوں کے زوال کے بعد جب خلجی' تغلق' سید' اور لودھی خاندان اقتدار میں آئے تو ان کے عہد میں آہستہ آہستہ فارسی زبان کو زوال ہو رہا تھا' کیونکہ شاہی خاندان اور امراء کے

خاندان ہندوستانی رسوم و رواج' آداب اور طور طریق اختیار کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ جب لودھی اور بعد میں سوری خاندان اقتدار میں آئے تو فارسی زبان کے تسلط کو شدید دھچکہ لگا' کیونکہ افغانوں کی مادری زبان فارسی نہیں تھی' اسی لئے انہیں اس زبان سے کسی قسم کا تعلق اور لگاؤ نہیں تھا۔ پھر وہ وسط ایشیا اور ایران کے امراء کے خلاف رد عمل کا اظہار بھی کرنا چاہتے تھے' جو فارسی زبان بولتے تھے اور ایرانی ثقافت کو عزیز رکھتے تھے اور شاید اس وجہ سے خود کو افغانوں کے مقابلہ میں برتر سمجھتے ہوں۔ اس وجہ سے افغانوں نے ایرانی طرز اور ایرانی ثقافت کو چھوڑ کر ہندوستانی طور طریق اختیار کر لئے اور فارسی کی جگہ انہوں نے ہندی زبان کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ اس وجہ سے افغانوں میں فارسی ہندوستانی نام ملتے ہیں جو انہوں نے اختیار کئے' جیسے کالا پہاڑ' عیسٰی خاں' وغیرہ' خاص طور سے جب سوری مغلوں کو شکست دے کر برسر اقتدار آئے تو انہوں نے فارسی زبان سے اپنی نفرت کا اظہار برملا کیا اور سماجی و معاشرتی طور پر ہندوستانی روایات اور رسومات افغان معاشرہ کا حصہ بن گئیں۔ لیکن دوبارہ سے مغلوں کی کامیابی اور افغانوں کی حکومت کے خاتمہ نے اس ثقافتی عمل کو روک دیا۔ اور ان کی فتح نے دوبارہ سے غیر ملکی ثقافت اور فارسی زبان کو ایک نئی زندگی دیدی کیونکہ مغلوں کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ایران سے ادیبوں' شاعروں' اور منتظمین کی آمد شروع ہو گئی' جو نسلی احساس برتری کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور انہوں نے مقامی ہندی معاشرے سے ہر قسم کے اشتراک سے پرہیز کیا۔ ان کی سرپرستی مغل دربار' نے کی کہ جس کی وجہ سے فارسی زبان کی حیثیت دوبارہ سے مستحکم ہو گئی اور ایک بار پھر حکمران طبقوں اور رعیت میں زبان کا فرق قائم ہو گیا۔ اکبر کے زمانہ میں جب فارسی زبان کی انتظامیہ کی زبان بنایا گیا تو اس نے مقامی زبانوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

لیکن نئے آنے والوں میں صرف امراء ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ عام لوگ بھی ہوتے تھے' جن میں سپاہی' فوجی' انتظامیہ کے نچلے درجہ کے اہل کار' ہنر مند' کاریگر' دست کار اور تاجر شامل تھے چونکہ ان لوگوں کا واسطہ عام لوگوں سے پڑتا تھا اس لئے زبان کا میل ملاپ اور اشتراک ان لوگوں کی وجہ سے ہوا۔ ان لوگوں کا تعلق چونکہ کسی مراعات یافتہ طبقہ سے نہیں ہوتا تھا اس لئے ان میں یہ احساس نہیں تھا کہ اپنے خاندان اور حسب نسب کو اعلیٰ رکھا جائے' اور خالص بغیر ملاوٹ کی فارسی زبان بولی جائے۔ ان احساسات کے نہ ہونے کی وجہ سے نچلے درجہ کے مسلمان طبقوں نے ہندوستانی رسومات و روایات کو بھی اختیار کیا اور ان کی زبانوں کو بھی' اس لئے اردو زبان کی تخلیق میں عوام کے اشتراک اور میل ملاپ کا زیادہ دخل ہے'

کیونکہ امراء اور ان کے متوسلین شعراء ادباء زبان کی فصاحت و بلاغت پر زور دیتے رہے اور غیر فصیح الفاظ و محاوروں کو زبان سے نکالتے رہے۔

دکن میں بہمنی سلطنت کے خاتمہ کے بعد گولکنڈہ اور بیجاپور میں دکنی زبان دربار کی زبان بنی جس میں مراٹھی' تیلگو' اور تامل زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوئے۔ مغلوں کی فتح کے بعد اورنگ آباد اور اس کے قریب کے علاقوں میں اورنگ آبادی زبان تشکیل ہوئی جو اردو زبان کے قریب تھی جب کہ دکن کے دوسرے علاقوں میں دکنی زبان لوگوں کی زبان رہی۔(2) اس لئے نویں صدی ہجری (15 ویں صدی عیسوی) میں دکن میں جس زبان کو فروغ ہوا اس کی جڑیں ہندوستان اور اس کے عوام میں تھیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس زبان میں جب عربی اور فارسی کے الفاظ کو استعمال کیا گیا تو انہیں ان کی اصل شکل میں نہیں بلکہ اس طرح سے لکھا گیا کہ جیسے بولا جاتا تھا' جیسے۔

صفحہ	سفے
طمع	طما
وضع	وضا
منع	منا
نفع	نفا
ملاحظہ	ملاذا
دیوانہ	دوانہ
جنگل	جگل
تسبیح	تسبی
صبح	صبا
خوشی	خشی

اس لئے دکن میں جس زبان کا فروغ ہوا اس کا تعلق اس سرزمین سے تھا اور اردو زبان کی حیثیت ایک مقامی زبان کی تھی جو اپنی موسیقیت اور آہنگ کی وجہ سے ممتاز تھی۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال بہت کم تھا' اور جو الفاظ استعمال بھی ہوتے تھے تو ان کا املا مقامی تلفظ کے تحت ہوتا تھا جس نے زبان کی خوبصورتی کو بڑھا دیا تھا۔

یہ زبان ابتداء میں ہندی' ہندوی' دہلوی' ہندوستانی' زبان ہندوستان ریختہ' اور آخر میں جا کر اردو کہلائی۔ جس وقت دکن میں اردو دکنی زبان کی حیثیت سے ترقی کر رہی تھی اس وقت

بھی شمالی ہندوستان میں اردو زبان عوامی سطح پر تو موجود تھی مگر حکمران طبقوں میں اب تک اس کو اختیار نہیں کیا گیا تھا اس لئے اردو کی حیثیت عوامی زبان کی تھی کہ جس میں عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال بہت کم تھا' اس کی بہترین مثال کبیر (1527ء) کے دوہے ہیں' جو عوامی زبان میں کہے گئے تھے' اور اسی لئے ان میں دلکشی' حسن اور مٹھاس ہے مثلاً۔

ایسا کوئی نہ ملا جاسوں رہیے لاگ
سب جگ جلتا دیکھا اپنی اپنی آگ
نینوں کی کر کوٹھری پتلی پلنگ بچھائے
پلکوں کی چق ڈال کے پیا کو لیا رجھائے

یا

غوطہ مارا سندھ میں موتی لائے پیٹھ
وہ کیا موتی پائیں گے جو رہے کنارے بیٹھ

ہندوستان میں فارسی زبان کی برتری اس وقت کم ہونی شروع ہوئی جب مغل خاندان کا زوال ہونا شروع ہوا' کیونکہ اب بادشاہ اور اس کا دربار اس قابل نہیں رہے کہ شعراء اور ادباء کی سرپرستی کر سکیں۔ اس لئے اہل قلم دربار سے نکل کر روزگار کی تلاش میں عوامی ہنگامہ خیز زندگی میں آئے۔ اس نے انہیں درباری ماحول کی مصنوعی زندگی سے بیگانہ' اور تکلیفوں اور مصیبتوں نے حقیقت پسند بنایا لیکن اب تک اظہار کا ذریعہ فارسی زبان ہی تھی۔ مغل دربار کی کمزوری کے نتیجہ میں ایران سے نئے شعراء اور علماء کی آمد بھی کم ہو گئی' اور ان کی وجہ سے فارسی زبان کو جو توانائی ملتی رہتی تھی وہ ختم ہو گئی۔

اس لئے اٹھارویں صدی عیسوی میں امراء کے طبقہ نے شمالی ہندوستان میں اردو کو فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اختیار کیا لیکن پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ اس زبان کی ہیئت اور شکل کو بدل دیا۔ اردو زبان چونکہ بنیادی طور پر مقامی زبان تھی۔ اس لئے اس کا ڈھانچہ مقامی الفاظ' تشبیہات' استعارات اور محاوروں پر تھا' اور یہی وجہ تھی کہ اس زبان کی جڑیں ہندوستان کے عوام میں تھیں۔ مغل معاشرے کے طبقاتی معاشرے میں کہ جہاں امراء خود کو عوام سے دور رکھتے تھے' اور ثقافتی لحاظ سے ان کی ثقافت کے معیار جدا تھے' وہ طبقاتی طور پر اس قدر حساس تھے کہ جب ان کے سامنے فارسی زبان چھوڑنے اور اردو زبان کو اختیار کرنے کا مسئلہ پیش آیا تو وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ وہ عوام کی اور نچلے درجہ کے طبقوں کی زبان کو اختیار کر کے اپنے طبقاتی احساس کو مجروح کریں۔

چونکہ مغل امراء اور حکمران طبقوں کا تعلق وسط ایشیاء ایران و عرب کے ملکوں سے تھا اس لئے وہ ذہنی طور پر کسی مقامی چیز کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے ذہن میں حسب و نسب کی پاکی' اور خالص خون کا جو تصور تھا' اس کے مطابق انہوں نے فوراً اردو زبان کو خالص کرنے کا عمل شروع کر دیا تاکہ ان کی اور عوام کی زبان میں فرق قائم رہے۔ اس عمل کو خصوصیت سے سراج الدین خاں آرزو 1756ء نے تیز تر کیا اور اردو زبان کی فصاحت و بلاغت کے معیار مقرر کئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس اردو زبان کو معیاری زبان قرار دیا جو کہ قلعہ میں بادشاہ' امراء اور درباری بولتے تھے اور قلعہ معلّٰی سے منسوب ہو کر اسے "اردوئے معلّٰی" کہا گیا۔

دوسرے مرحلہ میں اردو سے ہندی اور دوسری مقامی زبانوں کے الفاظ کا اخراج شروع ہوا اور ان کی جگہ فارسی و عربی کے الفاظ استعمال کئے جانے لگے۔ ان میں حاتم' سودا' درد اور دوسرے اردو کے شعراء کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ انہوں نے زبان کو خالص اور معیاری بنانے کے لئے اس بات پر زور دیا کہ فارسی اور عربی کے الفاظ کو ان کی اصل شکل میں لکھا جائے اور اب تک دکن میں خصوصیت سے انہیں ہندی شکل میں' اور عوامی تلفظ میں جو لکھا جاتا تھا اسے متروک کیا جائے۔ اس کے بعد ہندی محاوروں اور تشبیہات و استعاروں کی جگہ بھی فارسی نے لے لی۔ مثلاً محمد حسین آزاد نے آب حیات میں فارسی و ہندی تشبیہوں کو دیا ہے' جس سے زبان کے ثقافتی فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے' ہندی میں بالوں کی تعریف ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اڑنے سے تشبیہہ کی جاتی ہے' جب کہ فارسی میں ان کی جگہ مشک' بنفشہ' سنبل' اور ریحان کہا جاتا ہے۔ سانولی رنگت کو ہندی میں شام برن' میگھ برن کہا جاتا ہے جب کہ فارسی میں اس کے لئے سخن رنگ اور سیم رنگ استعمال ہوتا ہے۔ قاصد کو ہندی میں ابر اور ہنس کہا جاتا ہے جب کہ فارسی میں اسے نسیم' اور صبا سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

محمد حسین آزاد نے اردو زبان کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو کو کس طرح سے ہندوستان کے ماحول اور اس کی تشبیہات سے محروم کر کے اس میں ایران و توران اور عرب کے ماحول اور وہاں کی تشبیہات کو داخل کیا جن کا تعلق ہندوستان کی آب و ہوا' ماحول' اور ذہن سے بالکل نہیں تھا' مثلاً' شمشاد' نرگس' سنبل' بنفشہ' سروقد' مجنوں و لیلیٰ' شیریں فرہاد' مانی و بہزاد کی مصوری' رستم و اسفندیار کی بہادری' زحل کی نحوست' سہیل یمن کی رنگ افشانی' مشاہیر فارس' یونان' اور عرب کے قصے' راہ ہفت خواں' کوہ الوند' کوہ بے ستوں' جوئے شیر' جیحوں اور سیحوں وغیرہ۔(3)

اردو زبان کے دائرہ کو اس وقت اور مزید تنگ کیا گیا' جب اہل زبان کا تصور پیدا ہوا کہ صرف ان کی زبان معیاری اور فصیح ہے۔ باقی لوگ زبان تو بول سکتے ہیں مگر زبان میں نہ تو ردو بدل کر سکتے ہیں اور نہ اپنے روزمرہ اور محاورے استعمال کر سکتے ہیں۔ مثلاً دہلی کے چند محلوں اور خاندانوں کو اہل زبان ہونے کا فخر تھا' انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ۔

"میری تحقیق کے مطابق دہلی کے ہر محلہ میں ایک نہ ایک صاحب زبان موجود ہے۔ بعض جگہ دو اور بعض جگہ تین بھی مل جاتے ہیں۔ دو تین محلوں میں تو یہ تعداد چار اور پانچ تک پہنچتی ہے۔ دلی کے جن محلوں میں صاحبان فصاحت و بلاغت رہتے ہیں ان میں قلعہ مبارکہ' بنگلہ سید فیروز شاہ' حویلی صفدر جنگ.... قابل ذکر ہیں۔"(4)

انشاء نے اہل زبان ہونے کی جو شرائط مقرر کی ہیں وہ یہ ہیں:

1- والدین کا دارالخلافہ کی خاک پاک سے ہونا۔
2- اردو دانوں کی صحبت سے فائدہ اٹھانا۔
3- اردو کی تحصیل اور تحقیق کا شوق۔
4- تیز ذہن اور قادر طبع۔

لیکن محض دہلی کا رہنے والا اہل زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"کسی کا دہلوی ہونا اس بات پر موقوف نہیں کہ وہ دلی میں پیدا ہوا ہو۔ اگر یہی جواز ہو تو مغل پورہ کے رہنے والے اور بارہہ کے سید تمام دہلوی کہلائیں گے۔ دہلوی سے مراد وہی شخص ہے جس کا روزمرہ دہلی کا ہو۔ مغل پورہ والوں کی زبان لاہور والوں سے ملتی ہے۔ سادات بارہہ پر ان کے قبیلہ کی چھاپ ہے۔ دہلوی وہی ہیں جن کا نفیس مذاق ہو' موزوں لباس' اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ' مکان کی آسائش و زیبائش۔"(5)

اہل زبان کے بارے میں اپنا فیصلہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"مختصراً" یہ کہ بادشاہوں' اور امراء اور ان کے درباریوں اور حاضرباشوں سے اردو کی سند لینی چاہئے کیونکہ.... شاعر' ریاضی دان اور محاسب' مفتی اور طبیب' صوفی و خوبصورت عورتیں ان کی مجلس میں حاضر رہتی ہیں۔ اور فرقہ فرقہ کی اصطلاحیں سننے میں آتی ہیں اور وہ جس لفظ کو اصطلاح بنائیں اس کے قبول کرنے سے چھوٹے بڑے کو انکار نہیں ہو سکتا۔" (6)

اردو کو دہلی کے چند محلوں میں محدود کرنے اور اہل زبان کو اس کا مالک بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے لوگوں کی زبان غیر فصیح اور غیر معیاری ہو گئی۔ اس کا اندازہ میر تقی میر کے دو واقعوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک بار ان کے پاس میر قمرالدین منت اپنی غزل اصلاح کی غرض سے لائے تو انہوں نے ان کے وطن کے بارے میں پوچھا' جب معلوم ہوا کہ وہ سونی پت کے رہنے والے ہیں تو کہا "سید صاحب' اردوئے معلیٰ خاص دہلی کی زبان ہے۔ آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے' اپنی فارسی وارسی کہہ لیجئے"۔(7)

ان کا دوسرا واقعہ دہلی سے لکھنؤ کا سفر ہے' جس میں ان کا ساتھی ایک دیہاتی تھا۔ اس سے میر صاحب نے اس لئے بات کرنے سے انکار کر دیا کہ کہیں بات چیت اور گفتگو کی وجہ سے ان کی زبان میں دیہاتی اور گنوار کے لفظ نہ آ جائیں۔

اردو کو ہندی اور مقامی زبانوں کے الفاظ سے پاک کر کے اسے خالص بنانے کے عمل میں فارسی و عربی کے الفاظ کو اس میں شامل کرنا' ہندوستان میں مسلمان امراء کے معاشرے کی غیر ملکی ذہنیت کی عکاسی ہے۔ مغل امراء جن کا تعلق وسط ایشیا ایران سے تھا وہ پوری تاریخ میں اپنی غیر ملکی ذہنیت اور انفرادیت کو قائم رکھے رہے اور مقامی رنگ کو انہوں نے اختیار نہیں کیا کہ کہیں ان میں مل کر وہ اپنی شناخت نہ کھو دیں۔ مذہبی اعتبار سے بھی علماء ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے کہ ہندوستانی عادات' طور طریق' اور رسومات کو اختیار نہ کیا جائے۔ وہ انہیں مشرکانہ اور کافرانہ کہہ کر برا بھلا کہتے رہے۔ یہی ذہنیت ان کی اردو زبان کے سلسلہ میں رہی' کہ جب اس زبان کو انہیں اختیار کرنا پڑا تو انہوں نے اسے اس کے مقامی اور عوامی رنگ میں اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اسے فارسی کا رنگ دے کر غیر ملکی قالب میں ڈھال لیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمان حکمران طبقوں نے اس دائرہ سے ان مقامی مسلمانوں کو بھی خارج کر دیا کہ جن کا تعلق نچلے طبقوں سے تھا اور ان کی زبان کو معیاری تسلیم نہیں کیا۔ اس کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ نظیر اکبر آبادی کہ جس کا تعلق عوام کے نچلے طبقوں سے تھا اور جس نے انہیں کی زبان میں شاعری کی' اسے اردو والوں نے معیاری شاعر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور آزاد نے آب حیات میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کو فارسی رنگ میں ڈھالنے کے باوجود اس کا مقام اور رتبہ فارسی زبان سے کم رہا' اور غالب نے یہی کہا کہ۔

بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

اردو کے تمام بڑے شاعر اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں شاعری کرتے رہے اور اسی کو

اپنے لئے باعث فخر سمجھتے رہے اور یہ روایت اقبال تک آئی کہ انہوں نے بھی "گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" کہہ کر فارسی میں شاعری کی۔

اردو کو عوام سے کاٹ کر حکمران طبقوں میں محدود کرنے کا نقصان یہ ہوا کہ اردو کی جڑیں جو مقامی تھیں اور جن کی وجہ سے یہ توانائی اور قوت کے ساتھ ترقی کر رہی تھی' اس کا یہ عمل روک دیا گیا اور ایک ایسی زبان کو تشکیل کیا گیا کہ جس کا تعلق محدود طبقہ سے تھا۔ رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب ایک ایسی اردو میں لکھی گئی کہ جس سے صرف چند لوگ لطف اندوز ہو سکتے تھے۔

جب اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا' تو اس کے پس منظر میں بھی طبقاتی مفادات تھے۔ 1835ء میں اردو کو عدالتی زبان قرار دیا گیا جس کی وجہ سے ملازمتوں میں اکثریت مسلمان علماء کے خاندان کے لوگوں کی ہو گئی۔ اس وجہ سے ہندو تعلیم یافتہ طبقے نے ملازمتوں کے حصول کی غرض سے یہ مطالبہ کیا کہ اردو کے ساتھ ہندی بھی عدالتی اور سرکاری زبان ہو۔ اردو کے دفاع میں 1900ء میں الہ آباد سے ایک پمفلٹ شائع ہوا جس میں اردو کا دفاع اس لئے نہیں کیا گیا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے یا اس کا تعلق اسلام سے ہے بلکہ اس میں کہا گیا کہ اردو مہذب اور طبقہ اعلیٰ کی زبان ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ اس کی سرپرستی کرے اور نچلے طبقوں کے لوگوں کی مرضی پر نہیں چلے' اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کی ہر اسکیم اور منصوبہ جاہل عوام کی مرضی سے چلے گا اور اس طرح تہذیبی طور پر ترقی نہیں ہو سکے گی۔ (8)

اس سے شمالی ہندوستان میں مسلمان امراء کے سماجی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ اقلیت کے اثر و رسوخ کو دیکھا جائے اور اکثریت کو اس لئے نظرانداز کر دیا جائے کہ وہ جاہل اور غیر مہذب ہیں۔

ہندوستان میں تحریک آزادی کے دوران جب مسلمان زمینداروں اور جاگیرداروں کو یہ محسوس ہوا کہ ان کی خاندانی مراعات اور جائدادوں کو خطرہ ہے تو اس وقت انہوں نے اسلام کے ساتھ اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر پیش کیا' ورنہ اس سے پہلے وہ اس کو فارسی کے بعد دوسرا درجہ دیتے تھے۔ مگر جب انہیں عام مسلمانوں کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس وقت انہوں نے اردو کے تحفظ کا نعرہ لگا کر اسے مذہبی رنگ دے دیا اور اسے ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان قرار دیا۔ اس نے اردو ہندی تصادم کو پیدا کیا جس سے دو قومی نظریہ کو تقویت ہوئی' ورنہ اردو کی اپنی بنیاد اس سرزمین میں ہے اور اس کے بولنے والے ہر مذہب و ملت کے ہیں۔ اسے امراء کے طبقے نے اپنے مفادات کے تحت استعمال کیا اور اسے غیر ملکی قالب میں ڈھال دیا

اور کوشش کی کہ اس کی جڑیں یہاں سے نکال کر غیر ملک میں پیوست کریں۔ اس کے نتیجہ میں زبان کی ترقی رک گئی۔

اس لئے اگر اردو زبان کے بقا کا کوئی راستہ ہے تو وہ یہی ہے کہ اسے غیر ملکی رنگ سے نکال کر مقامی رنگ میں ڈھالا جائے اور اسے محدود دائرہ سے نکال کر وسیع میدان فراہم کیا جائے' اس کے لئے اردو بولنے والوں کو اپنی ذہنیت بدلنا ہوگی اور مقامی ماحول اور مقامی رنگ و بو کو محسوس کرنا ہوگا۔

حواشی

1) محمود شیرانی: پنجاب میں اردو۔ لاہور (؟) ص۔ 2-3-

2) Mohammad Sadiq : A History of Urdu Literature - Karachi (OXFORD) 1964. p.43, 45

3) محمد حسین آزاد: آب حیات (سنگ میل) لاہور (؟) 47-48-53-

4) انشاء اللہ خاں انشاء: دریائے لطافت۔ اورنگ آباد دکن 1935ء ص۔ 42-43

5) ایضاً: ص۔ 64-65

6) ایضاً: ص۔ 65-66

7) عبدالسلام: مضامین عبدالسلام۔ اعظم گڑھ (؟) 225-

8) Paul Brass: Religion and Language in Northern India Cambridge 1976 p.133

پاکستان ایک قومی اور جمہوری ریاست کیوں نہیں بن سکا؟

آج جب اس سوال کو اٹھایا جاتا ہے کہ پاکستان کیوں ایک قومی' جمہوری ریاست نہیں بن سکا' تو اس کا جواب صرف 1947ء کے بعد کے واقعات و حالات ہی میں نہیں ملتا بلکہ اس کا تعلق برصغیر میں مسلمان معاشرہ کی اس ذہنی و فکری ساخت سے ہے کہ جو ایک خاص ماحول میں ہوئی اور جس نے ریاست' حکمران' اور سیاسی نظام کے بارے میں ان کے خیالات کی تشکیل کی۔ لہٰذا اس مضمون میں پہلے ان عوامل کا جائزہ لیا جائے گا کہ جن کا تعلق ہمارے ماضی سے ہے' اور اس کے بعد ان حالات کا تجزیہ کیا جائے گا کہ جو ملک کی تقسیم کے بعد پیدا ہوئے۔ لیکن ہمارے ماضی اور حال میں ایک تاریخی تسلسل ہے اور پاکستان بننے کے بعد جن حالات سے ہم دوچار ہوئے اور جس رد عمل کا ہم نے اظہار کیا' اس میں اور ماضی میں گہرا رشتہ اور تعلق ہے۔

شمالی ہندوستان میں مسلمان حملہ آور محمود غزنوی (1030-998) کے زمانہ سے آنا شروع ہوئے اور محمد غوری (1206-1203) کی فتوحات کے بعد انہوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن یہ حکومت ہندو ریاستوں کے درمیان گھری ہوئی تھی اور اس لئے مستقل طور پر غیر محفوظ تھی۔ لہٰذا ترکوں کی حکومت کی بقا اور تحفظ اس میں تھا کہ دہلی کے تخت پر ایک مضبوط حکمران ہو جس کے پاس مستعد' جدید اسلحہ سے لیس' تجربہ کار فوج ہو' تاکہ وہ اپنی ہمسایہ ریاستوں کے خلاف مسلسل جنگ کی پالیسی کو جاری رکھ سکیں۔ اس مرحلہ پر مسئلہ یہ بھی تھا کہ فوج کے لئے نئے لوگوں کو کہاں سے اور کیسے حاصل کیا جائے؟ یہ فوجی انہیں ان مسلمان آبادیوں سے ہی مل سکتے تھے جو فتح کے بعد مفتوحہ علاقوں میں قائم ہو گئیں تھیں۔ ان لوگوں کو ذہنی طور پر فوج میں شامل ہونے اور جنگوں میں جان دینے کے لئے اسی وقت تیار کیا جا سکتا تھا جب کہ ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا جائے اور یہ جب ہی ہو سکتا تھا کہ جب ان میں اور ہندوؤں میں مذہب کی گہری تفریق کو ابھارا جائے۔ اس لئے ہندو اکثریت اور ہندو ریاستوں کے حملے کے خوف نے ان کی اُس ذہنیت کو پیدا کیا کہ ان کی حفاظت صرف اس صورت میں ہو سکتی

ہے کہ جب ایک مطلق العنان حکمران ہو' مضبوط مرکز ہو' اور طاقت ور فوج ہو۔ ان کے خیال میں ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خلاف صرف طاقت و قوت کی بنیاد پر زندہ رہا جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں ان حکمرانوں کے لئے بڑا احترام پیدا ہوا کہ جنہوں نے جنگوں اور فتوحات کی پالیسی پر عمل کیا اس کے برعکس جن حکمرانوں نے جنگی معاملات میں کمزوری دکھائی ان پر زبردست تنقید کی گئی اور حکومت کے زوال کی ذمہ داری انہیں پر ڈالی گئی۔

ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقے اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ چونکہ ان کے اقتدار اور طاقت کی بنیاد مسلمان جماعت پر ہے' لہٰذا ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مذہب کا استعمال ضروری ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے تمام مسلمان حکمران خود کو حامئ دین و محافظ مذہب و ملت کہلاتے رہے۔ اگرچہ وہ عملی طور پر سیاسی نظام کو سیکولر بنیادوں پر چلانے پر مجبور تھے' مگر انہوں نے عوام کی حمایت کی خاطر مذہب کو اس طرح استعمال کیا کہ علماء کی سرپرستی کی' صوفیا و مشائخ کو تحفہ تحائف و نذرانے دیئے' اور چند مذہبی قوانین کو کہ جن کا تعلق عملی طور پر سیاسی نظام اور ان کے مفادات سے نہیں تھا' انہیں برقرار رکھا۔ ساتھ ہی میں انہوں نے مسلمانوں میں اس ڈر اور خوف کو پیدا کیا کہ اگر ان کی حکومت ختم ہو گئی' یا کمزور ہو گئی تو ہندوستان سے مسلمان جماعت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کی مثال خلجی دور کے ایک واقعہ سے مل سکتی ہے۔ جب خسرو ملک نامی ہندی نژاد غلام نے آخری خلجی حکمران قطب الدین مبارک (1316-1320) کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کیا تو اسے فوراً ہندو مشہور کر کے یہ پراپیگنڈا کیا کہ ہندو دہلی کی سلطنت پر قابض ہو گئے ہیں اور اب ہندوستان میں مسلمانوں کی جان و مال خطرے میں ہے۔ یہ وہ ڈر اور خوف تھا کہ تمام مسلمان امراء غیاث الدین تغلق (1320-1325) کی راہنمائی میں متحد ہو گئے' اور خسرو ملک کو شکست دے کر دہلی کے تخت کو دوبارہ سے حاصل کر لیا اور جیسا کہ معاصر تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس فتح کے بعد مسلمان امراء کو اطمینان ہوا کہ ان کی جائدادیں اور مراعات محفوظ ہو گئیں۔

اس کی دوسری مثال اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی ہے کہ جس کی وجہ سے راسخ العقیدہ امراء میں زبردست ہراس پیدا ہو گیا' اور اسلام خطرے کا نعرہ لگا کر علماء نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مسلمان امراء چاہتے تھے کہ حکومت و اقتدار میں صرف انہیں کو حصہ ملے اور کسی دوسرے کو اس میں شریک نہیں کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے مذہب کو استعمال کیا جاتا تھا' کیونکہ اگر ریاست کو اسلامی کہا جائے تو اس صورت میں اس کے نظم و نسق کو چلانے کی ذمہ

داری صرف مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات ان کے مفادات میں تھی کہ حکومت کو اسلامی کہا جائے اور یہ بھی ان کے مفاد میں تھا کہ ہندو اور مسلمان ثقافتی و سماجی طور پر ایک دوسرے کے قریب نہ آئیں۔ مذہب کے اس استعمال کی وجہ سے مسلمان معاشرے میں طبقاتی تضادات بھی گہرے نہیں ہوئے اور نچلے طبقوں کے مسلمان اپنے حاکموں پر محض اس لئے فخر کرتے رہے کہ ان کا تعلق ایک ہی مذہب سے ہے اور ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کے دھوکے پر وہ اسلامی مساوات و اخوت کے واہمہ میں مبتلا رہے۔

ہندوستان میں مغل خاندان کے زوال کے ساتھ ہی مسلمان حکمران طبقوں کی بنیاد جن ستونوں پر تھی وہ ٹوٹ گئے یعنی طاقت ور حکمران' اور مضبوط و مستعد فوج۔ ان کی اس کمزوری کے ساتھ ہی جب سکھوں' مراہٹوں' اور جاٹوں نے مغل سلطنت پر حملے شروع کئے تو انہوں نے اپنی کھوئی طاقت کا نعم البدل ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی (1747-1773ء) کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تاکہ ایک طاقت ور شخصیت' اور تجربہ کار و مضبوط فوج مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔ بعد میں سید احمد شہید (وفات 1731ء) کی جہاد تحریک بھی اسی ذہنیت کا نتیجہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو امیرالمومنین کی شخصیت اور جہاد کے ذریعہ بچایا جا سکتا ہے۔ 1857ء کے ہنگامہ کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسلمان حکمران طبقوں کی آخری کوشش تھی کہ وہ طاقت کے ذریعہ اپنی حکومت کو بحال کرنا چاہتے تھے' اور اس میں ناکامی کے بعد ان میں مزاحمت کرنے کی تمام خواہشات ختم ہو گئیں۔

لہذا جب ہندوستان میں انگریزی اقتدار قائم ہوا ہے تو مسلمان حکمران طبقے اپنی قوت و توانائی کھو چکے تھے۔ اسی وجہ سے سید احمد خاں نے ان کا مفاد اس میں دیکھا کہ وہ انگریزی سے مفاہمت کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کریں۔ سرسید اور مسلمان امراء کا طبقہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دائمی قیام کے خواہش مند تھے کیونکہ اب وہ سمجھتے تھے کہ صرف اسی صورت میں وہ خود کو ہندو خطرے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اس کا اظہار سرسید کے بعد بھی ان کے جانشینوں کی جانب سے مسلسل ہوتا رہا' مثلاً اکتوبر ء میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کے اجلاس میں جو چند تجاویز پاس ہوئیں ان میں سے ایک میں کہا گیا کہ:

> "مسلمانوں کی..... بہبود ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے دوام اور استحکام پر منحصر ہے..... کانگرس میں چونکہ نیابتی حکومت اور امتحانات مقابلہ کے اجراء کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے لئے مضر ہے اس لئے مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکا جائے"

دسمبر 1906ء میں وقار الملک نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہماری تعداد بمقابلہ دوسری قوموں کے ہندوستان میں ایک خمس ہے۔ اب اگر کسی وقت ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا' اور ہماری جان' ہمارا مال' ہماری آبرو' ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہو گا۔"

جب مسلمان امراء اور مراعات یافتہ طبقے نے اپنا تحفظ انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا اور اپنے مفادات کو ان کی حکومت سے منسلک کر دیا تو اس کے بعد انہوں نے ہر اس تحریک کی مخالفت کی جس سے انگریزی حکومت کمزور ہوتی۔ اس وجہ سے سرسید نے کانگرس کے قیام اور اس کی سیاسی سرگرمیوں پر زبردست تنقید کی۔ جب کانگرس کی جانب سے حکومت میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا سوال اٹھایا گیا تو سرسید نے مسلمان امراء کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ استدلال دیا کہ چونکہ انتخابات کی صورت میں ہندو ووٹر زیادہ ہوں گے اور مسلمان کم' اس لئے ہندو امیدوار زیادہ کامیاب ہوں گے' انہوں نے نمائندہ طریقہ نظام کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دلیل بھی دی کہ مسلمان جائداد' دولت' اور تعلیمی قابلیت میں ہندوؤں کے برابر نہیں' اس لئے انتخاب کا جو بھی طریقہ کار ہو گا اس میں ہندو ہی کامیاب ہوں گے اور مسلمان ان سے کسی بھی صورت میں مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس کا جو منطقی نتیجہ نکلا وہ یہ کہ انگریزی حکومت ہندوستانیوں کی شرکت کے بغیر حکومت کرے اور مسلمان اس حکومت کے وفادار رہیں۔

چونکہ انگریزی حکومت کے بھی یہ مفاد میں تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہ ہو اور ہندوؤں نے جو سیاسی تحریک شروع کر رکھی ہے مسلمان اس سے دور رہیں اس لئے انہوں نے بھی مسلمانوں میں جمہوریت کے خلاف جذبات پیدا کئے۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈور ماریسن نے ایک بار طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "جمہوری حکومت اقلیتوں کو لکڑی کاٹنے والے اور پانی بھرنے والے کے درجہ پر پہنچا دے گی اور مسلمانوں کا ملک میں نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔"

اس پس منظر میں مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کہ جن کا تعلق امراء کے مراعات یافتہ طبقہ سے تھا ان میں جمہوریت کی مخالفت پیدا ہو گئی اور انہوں نے جمہوری نظام کو صرف اس نظر سے دیکھا کہ اس میں اقلیت کی کوئی اہمیت و حیثیت نہیں ہو گی اور وہ اکثریت کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔ اس ذہنیت کو پیدا کرنے میں ان کے تاریخی شعور نے بھی حصہ لیا' کیونکہ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ملک کے حکمران رہ چکے ہیں' اور انہوں نے قوت و طاقت اور

رعب و دبدبہ سے ہندوؤں پر حکومت کی ہے' اور وہ نسلاً اعلیٰ و برتر ہیں' لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ حکومت ہندوؤں کے پاس چلی جائے اور وہ ان کے محکوم ہو جائیں۔

لہٰذا جمہوری طرز حکومت ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ہندو اکثریت کی حکومت تھی۔ 1920ء میں محمد علی جوہر نے بھی انہیں بنیادوں پر جمہوریت کی مخالفت کی کہ چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندوؤں کے مقابلہ میں تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں لہٰذا یہ ان کے مفاد میں نہیں کہ یہاں جمہوری نظام قائم ہو۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جمہوریت کے بارے میں یہ خیالات مسلمان امراء اور طبقہ بالا کے تھے کہ جن کا تعلق اشراف سے تھا اور جو مسلمانوں کے نچلے طبقوں سے کسی قسم کے سماجی و معاشرتی روابط نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انگریز حکومت کے ابتدائی دور میں انہوں نے اپنے بچوں کو حکومت کے اسکولوں میں اس لئے نہیں بھیجا کہ وہاں انہیں عام لوگوں کے بچوں کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔ وہ اپنے رتبہ' منصب اور حیثیت کے بارے میں بڑے حساس تھے اور چونکہ جمہوریت کے تصور میں عوام کی نمائندگی ہوتی تھی' جو ان کی امیرانہ ذہنیت سے تضاد کھاتی تھی' اس لئے انہوں نے انگریزی حکومت پر ہمیشہ یہ زور دیا کہ وہ تعداد کے بجائے اثر و رسوخ دیکھے۔ انہوں نے "یو پی کے مسلمانوں کی نمائندگی" کے نام سے ایک اپیل میں حکومت سے کہا کہ "وہ اس ملک کے جاگیردار تھے اور اب تک ان صوبوں میں ان کا اثر و رسوخ ہے' اس لئے ان کے حقوق کے بارے میں تعداد کے بجائے ان کے خاندان کی اہمیت کو دیکھا جائے۔" ان کی کوشش یہ تھی کہ بحیثیت اقلیت کے وہ حکومت کی خوشنودی کے ذریعہ اپنی مراعات کو باقی رکھیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے عام مسلمانوں میں پس ماندگی اور بے چارگی کے احساسات کو پیدا کیا تاکہ وہ ان کے دست نگر رہیں اور ان میں یہ ڈر اور خوف رہے کہ جمہوریت میں ان کی فلاح اور بہبود نہیں۔ انہیں جذبات کا اظہار اقبال نے اپنے مشہور خطبہ الہ آباد میں کیا جب انہوں نے اس بات کو دھرایا کہ مغربی طرز کی جمہوریت ہندوستان میں نہیں چل سکتی۔ ان کی شاعری میں بھی جمہوریت دشمنی کے خیالات موجود ہیں' خاص طور سے ان کے اس شعر میں کہ۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس سے مسلمان امراء کے طبقے کے ذہن کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے کہ جو عوام میں مل کر اپنا سماجی مرتبہ کھونا نہیں چاہتے تھے اور بحیثیت طبقہ بالا اپنی حیثیت تسلیم کروانا چاہتے

تھے۔

اس پس منظر میں مسلمان بورژوا طبقے کے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ حکومت سے مفاہمت کر کے اس کی سرپرستی میں مراعات حاصل کرے۔ اس تعاون کے نتیجہ میں جداگانہ انتخاب اور ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم وجود میں آئے تاکہ مقابلہ کے بجائے وہ اپنے خاندان اور سماجی مرتبہ کی بنیاد پر اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ اس کے بعد سے اس طبقہ کا مسئلہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کی جائیں۔ اور اپنے سماجی مرتبہ کو برقرار رکھا جائے۔ انہوں نے کبھی مسلمان عوام کی اکثریت کہ جن کا تعلق کسانوں' مزدوروں' اور نچلے درجے کے کام کرنے والوں سے تھا' ان کی معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کا نہیں سوچا۔

ان حالات نے ہندوستان میں مسلمان جماعت کی جس ذہنیت کی تشکیل کی' اس کی بنیادیں تھیں' اکثریت کا خوف' مضبوط شخصیت اور فوجی قوت' اور مذہب کا خطرہ' حکمران طبقوں کی یہی وہ ذہنیت تھی کہ جو پاکستان بننے کے بعد بھی برقرار رہی۔ اور کسی نہ کسی شکل میں پاکستان کے سیاسی عمل میں اس کا کردار رہا۔

پاکستان تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں مسلم لیگ کی کوششوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن مسلم لیگ کی لیڈر شپ کا تعلق مسلمانوں کے طبقہ بالا سے تھا اور ان کی جڑیں مسلمان عوام میں نہیں تھیں۔ پاکستان کی جنگ ایک دستوری جنگ تھی کہ جس میں سیاسی گفت و شنید و بات چیت کے ذریعہ معاملات طے ہوئے۔ فرانز فینن نے کہا ہے کہ جن نو آبادیات میں آزادی کی تحریکیں مصالحتی اور دستوری ہوں ان میں عوام کی نمائندگی گہری نہیں ہوتی' مگر جو جنگیں خون ریز ہوں' اور اجتماعی قوت سے لڑی جاتی ہوں' ان میں عوام کی شمولیت بڑھ جاتی ہے اس لئے آزادی کے بعد ان میں عوام کو زیادہ نمائندگی ملتی ہے۔ پاکستان چونکہ اس عمل کے نتیجہ میں وجود میں نہیں آیا اس لئے حکومت کے اداروں پر بورژوا طبقہ کا اثر و رسوخ باقی رہا اور انہوں نے سیاسی عمل سے عوام کو دور رکھ کر ان اداروں کی مدد سے کہ جن میں بیوروکریسی' فوج' اور عدلیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں' عوام پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔

جمہوری عمل کے خلاف ابتداء ہی سے پاکستان کے حکمران طبقوں نے اس طریق کار کو اختیار کیا کہ انہوں نے عوام میں اس ڈر اور خوف کو پیدا کیا کہ ہر لمحہ اس ملک کا وجود خطرے میں ہے اور یہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے جو اس کو کسی بھی لمحہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے' خصوصیت سے ہندو دشمنی کی بنیاد پر ہندوستان کے حملہ کا خطرہ لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا گیا۔ لہٰذا اس پس منظر میں اسی تاریخی نظریہ کو تقویت دی گئی کہ ایک طاقت ور' مطلق العنان

شخصیت' اور جدید اسلحہ سے لیس مستعد فوج ہی اس ملک کی بقا کی ضامن ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب 1965ء کی جنگ ہوئی تو یہ کہا گیا کہ اچھا ہوا کہ محترمہ فاطمہ جناح سربراہ مملکت نہیں' ورنہ وہ اس ملک کا دفاع نہیں کر سکتی تھیں' اور ایوب خاں کی ذات میں انہیں اس ملک کی حفاظت کرنے والا مل گیا۔ افسوس یہ ہے کہ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر فاطمہ جناح سربراہ ہوتیں' تو 1965ء کی جنگ ہی نہیں ہوتی۔ ملک کے وجود کے خطرے کے پیش نظر عوام یہی سمجھتے ہیں کہ آمر' اور مطلق العنان شخصیتیں ڈنڈے کے زور سے اس ملک کے مسائل کو حل کر سکتی ہیں' اسی لئے ہر فوجی حکومت کے آنے پر عوام میں نئی امیدیں پیدا ہوئیں۔

چونکہ پاکستان تحریک کی بنیاد مذہب پر تھی' اس لئے پاکستان بننے کے بعد علماء نے اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنایا جائے۔ 1949ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس بات پر زور دیا کہ نئی ریاست میں اہم عہدے صرف ان کو ملنا چاہئیں جو اسلامی عقائد پر ایمان رکھتے ہوں' جو غیر مسلم ہیں یا صرف ثقافتی طور پر مسلمان ہیں انہیں ریاست کی پالیسی بنانے میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ ان علماء کی سفارش پر 1949ء میں دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کی' جس میں کہا گیا کہ اقتدار اعلیٰ کی مالک خدا کی ذات ہے اور یہ کہ کوئی قانون قرآن و حدیث کے خلاف نہیں بن سکتا۔ یہ دونوں باتیں جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں' کیونکہ جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہوتا ہے اور ان کی نمائندہ اسمبلی کو قانون بنانے اور تبدیل کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اس لئے جمہوریت کو اسلامی بنانے کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں اجتہاد اور اجماع کو اسمبلی سے ملانے کی کوشش کی گئی۔ سربراہ جو اسلامی حکومت میں تاحیات ہوتا ہے اس کے لئے پانچ سال کی شرط مقرر کی گئی اور عورت کو سربراہ مملکت بنانے اور اس کے الیکشن لڑنے پر شرائط عائد کی گئیں۔ ان پیچیدگیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو دستور بن سکا' اور نہ ہی انتخاب ہو سکے اور جب 1955ء میں غلام محمد نے بیوروکریسی کی مدد سے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور عدلیہ نے اس فیصلہ کی توثیق کر دی تو اس کے بعد سے پاکستان میں جمہوری عمل کی راہیں مسدود ہو گئیں اور پاکستانی قوم کے تشکیل ہونے کے امکانات بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔

کیونکہ جب جمہوری عمل کے بغیر اس بات پر زور دیا گیا کہ لوگ اپنی وفاداری کا مرکز قومی یک جہتی کو بنائیں تاکہ ایک ریاست اور قوم کی تشکیل ہو سکے تو اس پر زور دیتے ہوئے اس بات کی توقع کی گئی کہ اس کے علاوہ لوگ دوسری تمام وفاداریوں کو ترک کر دیں اور ان

وفاداریوں کو صوبائی اور متعصبانہ کہا گیا۔ اس عمل نے قومیت کے درجہ کو گھٹا کر ریاست کے درجہ کو بڑھا دیا۔

قومی یک جہتی کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ طبقاتی تضادات کو کم سے کم کیا جائے اور قومیتوں کے جذبات کو ختم کر کے انہیں ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ لیکن اس عمل میں معاشرہ کی ساخت اور ہیئت کو فراموش کر دیا گیا کہ لوگوں کی جو وفاداریاں خاندان، قبیلہ، ذات، دیہات، شہر اور صوبوں سے ہوتی ہیں ان کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور جب تک انہیں قومی معاملات میں برابر کی نمائندگی نہیں دی جائے گی اس وقت تک قومی یک جہتی کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نمائندگی کی غیر موجودگی کی وجہ سے صوبائی جذبات گہرے ہوتے چلے گئے اور قومیتوں سے لوگوں کی وفاداریاں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔

لہٰذا اس مرحلہ پر ہماری ماضی کی تاریخی ذہنیت ابھری کہ جس میں اکثریت کا ڈر اور خوف تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں یہ اکثریت ہندوؤں کی تھی، تو اب صوبائی اور قومیتوں کے جذبات نے اس اکثریت کے اقتدار کے خوف کو اپنے درمیان پایا۔ ابتداء میں پنجاب کے صوبہ کو بنگال کی اکثریت سے خوف تھا اور اس کا عارضی حل انہوں نے ون یونٹ اور پیرٹی (PARITY) کے ذریعہ کرنا چاہا کہ جس نے جمہوری عمل کو آگے بڑھنے سے روک دیا (بنگلہ دیش آزاد ہونے کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ اچھا ہوا کہ مصیبت سے جان چھوٹی، یہ تاثر بھی اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا)۔ آج جب کہ بنگلہ دیش آزاد ہو چکا ہے، اب پنجاب کی اکثریت کا خوف دوسرے تین صوبوں کو ہے کہ جو جمہوریت کی شکل میں پنجاب کے اقتدار کو دیکھتے ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان راہنماؤں نے جمہوریت کی اس لئے مخالفت کی کہ مسلمان جاہل اور پس ماندہ ہیں اور ہندوؤں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی دلیل کو پاکستان بننے کے بعد دوسرے نقطہ نظر سے اختیار کیا گیا کہ چونکہ پاکستان کے عوام کی اکثریت جاہل، غیر تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر ناتجربہ کار ہے اس لئے وہ جمہوریت کے قابل نہیں۔ ایوب خان نے تو جمہوریت کو صرف سرد ملکوں کا نظام قرار دیا جو کہ پاکستان جیسے گرم ملکوں میں ناقابل عمل ہے۔

اس لئے اکثریت کو سیاسی طور پر غیر تربیت یافتہ قرار دے کر جمہوریت کو ایک ایسی شکل میں بار بار نافذ کرنے کی کوشش کی گئی کہ جس میں حکمران طبقے اپنے اقتدار کو برقرار رکھ سکیں۔ انہیں کوششوں کے نتیجہ میں بنیادی جمہوریت، ریفرنڈم، اور مجلس شوریٰ قسم کے نظام پیدا ہوئے جن پر جمہوریت کا لیبل چسپاں کر کے ان کے ذریعہ عوامی نمائندگی کا دعویٰ کیا گیا۔

پاکستان کے حکمران طبقے جب عوام سے کٹ گئے اور ان کی طاقت و حمایت کو انہوں نے

اپنے لئے غیر ضروری سمجھ لیا' تو انہیں اپنے مفادات اور مراعات کے لئے کسی طاقت کی سرپرستی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ برطانیہ تو دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی عالمی طاقت کھو چکا تھا اس لئے اس کی جگہ امریکی حمایت سے پر کی گئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے امریکی مفادات کا اپنے ملک میں تحفظ کیا۔ دوسری طرف امریکی امداد نے حکمران اداروں کو مضبوط بنانے میں مدد دی۔ اس کے نتیجہ میں اس وقت امریکی استعمار کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئی ہیں کہ پاکستان میں اقتدار میں آنے والی ہر جماعت ان کے ذریعہ طاقت میں آنے کا سوچتی ہے۔

پاکستان میں جمہوری عمل کو جو مسائل درپیش ہیں ملک کی سیاسی جماعتیں بھی ان کو حل کرنے میں ناکام ہو گئی ہیں۔ کیونکہ ان جماعتوں کی لیڈرشپ کا تعلق جاگیردارانہ طبقہ سے ہے اس لئے یہ ملک کے نظام کو تبدیل کرنے یا عوام کو ان کے حقوق دینے سے زیادہ اقتدار میں آنے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں کا ڈھانچہ غیر جمہوری ہے۔ ان کے راہنما ان جماعتوں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور جماعت کے عام کارکنوں سے رائے لینا اور انہیں جماعت کے معاملات میں شریک کرنا انکی روایت نہیں۔ اکثر سیاسی جماعتوں نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ عوام کی سیاسی تربیت کی جائے اور انہیں ملک کے مسائل سے برابر آگاہ کیا جائے۔ ان جماعتوں کے پاس کوئی تحقیقی شعبہ' یا دانشوروں کا گروپ نہیں کہ جو انہیں ملکی و غیر ملکی معاملات میں مشورہ دے۔ اس لئے سیاست ہمارے ہاں محض جوڑ توڑ اور سازش کا نام ہو کر رہ گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ "سیاست" کے عام معنی دھوکہ دہی و فریب کے ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سیاست کے اس منفی رجحان کا فائدہ حکمران طبقوں کو پہنچتا ہے جو ملک کی پس ماندگی کا ذمہ دار سیاست دانوں کو ٹھہرا کر آمریت کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے بیوروکریسی' فوج' عدلیہ اور دوسرے حکمرانی کے ادارے مضبوط سے مضبوط تر ہو رہے ہیں کیونکہ بغیر تنقید اور رکاوٹ کے ان کی قوت و طاقت بڑھ رہی ہے اور اتنے ہی جمہوری عمل کے امکانات ختم ہو رہے ہیں۔ جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے اس نظام کی مکمل حمایت کرتے ہیں کیونکہ جمہوری عمل کی غیر موجودگی میں انہیں معاشرے کے نچلے طبقوں کے استحصال کے پورے پورے مواقع ملتے ہیں۔ اس لئے حالات سے تنگ آکر جو عوامی بغاوتیں ابھرتی ہیں تو انہیں اس لئے آسانی سے دبا دیا جاتا ہے کہ یہ بغاوتیں بغیر کسی راہنمائی کے اچانک ابھرتی ہیں۔ بار بار کی یہ ناکام عوامی بغاوتیں عوام کو مایوس اور بے حس بناتی ہیں اور ان کا اعتبار ہر چیز سے اٹھ جاتا ہے' بدقسمتی سے پاکستان اس وقت اسی صورت حال سے دوچار ہے۔

یہ وہ حالات تھے کہ جن کی وجہ سے پاکستان ایک جمہوری' اور قومی ریاست نہیں بن سکا۔
مگر سوال یہ ہے کہ ہمارے حکمران طبقے عوام کو اسی طرح نظرانداز کر کے؛ غیر ملکی امداد کے سہارے کب تک حکومت کریں گے اور کیا تاریخی عمل جو عوام کو برابر باشعور کر رہا ہے وہ کس مرحلہ پر آمریت' مطلق العنانیت' اور مخصی حکومت کو چیلنج کرے گا؟ اگرچہ اس کا تعلق ایک علیحدہ موضوع سے ہے' مگر میں اتنا ضرور کہوں گا وہ وقت قریب ہے کہ جب ہمارے حکمران طبقے و ادارے اپنی قوت و توانائی کھو کر کھوکھلے ہو جائیں گے اور ان کی جگہ ایک جمہوری اور قومی حکومت ضرور لے گی۔

تاریخ اور ماضی

انسان کا ماضی دنیا کی عمر کے لحاظ سے زیادہ پرانا نہیں' لیکن ماضی کی اہمیت قوموں میں انتہائی اہمیت کا باعث بن گئی ہے اور قوموں کے مہذب اور متمدن ہونے کا پیمانہ یہ ہے کہ کس کا ماضی کتنا پرانا ہے۔ جن قوموں کا ماضی زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہا ایسی قوموں کو "تاریخ سے محروم لوگ" کہہ کر انہیں تمدن کے دائرہ سے خارج کر دیا جاتا ہے' کیونکہ تاریخ وہ واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعہ قومیں اپنے کارنامے اور اپنے تاریخی عمل کو محفوظ رکھتی ہیں' اور جب کسی قوم کی تاریخ ہی نہیں ہو گی تو اس کے پاس ماضی میں اپنے وجود کا کوئی ثبوت بھی نہیں ہو گا' اور اسی سبب سے اقوام عالم میں اس کا کوئی مقام نہیں ہو گا۔

ماضی کی علامتوں میں سب سے اہم تاریخی یادگاریں ہوتی ہیں۔ ان یادگاروں میں پرانی عمارتیں' مجسمے' آلات و اوزار' برتن' اور زیورات و لباس شامل ہوتے ہیں۔ ان اشیاء کو دیکھنے کے بعد ماضی کی عظمت کا احساس دل میں ہوتا ہے اور قدیم عمارتوں اور اشیاء کے ذریعہ تخیل کی مدد سے ماضی انسان کے ذہن میں دوبارہ سے زندہ ہو جاتا ہے اس لئے ماضی کے یہ نوادرات اور آثار ماضی کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں اور اس کا تعلق زمانہ حال سے قائم کرتے ہیں۔

خصوصیت سے قدیم عمارتوں میں ماضی اپنی شان و شوکت کے ساتھ سمو جاتا ہے۔ جس قدر عمارتیں پرانی ہوتی ہیں' اسی قدر مختلف زمانے اور عہد ان میں رچ بس جاتے ہیں اور اسی قدر ان کا اثر دلوں پر ہوتا ہے۔ یہی حال ان اشیاء کا ہوتا ہے کہ جنہیں ماضی میں لوگوں نے استعمال کیا تھا اور وقت کے ساتھ یہ ماضی کو سمیٹ کر خوبصورت اور دلکش ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ماضی کی دلکشی کا اندازہ صرف بادشاہوں کے محلات اور ایوانوں ہی سے نہیں ہوتا' بلکہ اس کا اندازہ ان اوزاروں اور آلات سے بھی ہوتا ہے جو کہ دست کاروں اور ہنرمندوں نے استعمال کئے تھے۔ اگرچہ عام انسان کی گھریلو استعمال کی چیزیں سیدھی سادھی اور معمولی ہوتی ہیں' مگر یہ بھی اپنے اندر تاریخی عمل کو چھپائے ہوئے ہوتی ہیں۔

ماضی کے ان نوادرات کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ ان سے تاریخی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ انسانی معاشرے کے ارتقاء کی مجسم تصویریں ہوتی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر اور جانچ کر کسی

عہد کے انسانی ذہن اور اس کے طرز معاشرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ تاریخی عمل کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ انسان درجہ بدرجہ کس طرح اور کیوں کر ترقی کی جانب گامزن ہوا' اور آج ہم ترقی کے کون سے درجہ پر ہیں۔

لیکن انسان ماضی کے ان نوادرات سے اسی وقت سیکھ سکتا ہے جب کہ اس کے پاس تاریخ کا علم ہو۔ ان کی قدر و قیمت کا انحصار معاشرہ کی معلومات پر ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ ذہنی و تاریخی طور پر پس ماندہ ہو تو اس کے لئے قدیم نوادرات معمولی ٹھیکرے اور بے کار اشیاء ہو جاتی ہیں' مثلاً تاج محل کی خوبصورتی سے اس وقت تک لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا جب تک کہ اس کی تاریخ اور اس عہد کی فن کارانہ خوبیوں سے واقفیت نہ ہو۔ اس لئے معاشرہ کا علم یا جہالت ماضی کی یادگاروں کو ہر دور میں ایک نئے انداز سے دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک عمارت اس وقت تک اپنی خوبیوں سے محروم رہتی ہے جب تک کہ کوئی ماہر اور علم شناس اس کی ان خوبیوں کو اجاگر نہیں کرے۔ موہن جوڈرو کی گلیاں' عمارتیں' اور اس میں پائے جانے والی اشیاء اس وقت تک اہم نہیں ہوں گی جب تک کہ ان کا تقابل اس عہد کے دوسرے معاشروں سے نہیں کیا جائے۔

یادگاروں کو محفوظ کرنے اور ان سے متاثر ہونے کا رجحان معاشرہ کی سیاسی جدوجہد میں اور بڑھ جاتا ہے' خصوصیت سے جب قوموں میں برتری اور کمتری کی جدوجہد ہو۔ نوآبادیاتی دور کے خاتمہ کے بعد جب نئی قوموں کی تشکیل ہوئی تو انہوں نے اپنی شناخت کے لئے ماضی کا سہارا لیا' اسی لئے مصر میں اہرام مصر۔ اور ماضی کی یادگاریں مصری قوم کے لئے باعث فخر بن گئیں۔

ماضی کی یادگاروں کو محفوظ کرنے کا رجحان یورپ میں انیسویں صدی میں ہوا اور بیسویں صدی تک تاریخی ورثہ کی حفاظت اپنے عروج پر پہنچ گئی' اسی سے متاثر ہو کر ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں ماضی کے ورثہ کی حفاظت کا کام شروع ہوا اور جگہ جگہ میوزیم کی شکل میں ان چیزوں کی حفاظت بھی کی گئی اور ان کی نمائش بھی۔ ان یادگاروں کی حفاظت کی وجہ سے ماضی کا اثر اور گہرا ہو گیا۔

جہاں ماضی کی یہ یادگاریں انسانی دل و دماغ پر اپنا پر شکوہ اثر چھوڑتی ہیں اسی کے ساتھ ان عمارتوں پر زمانہ کے اثرات کی وجہ سے زوال کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی خستگی' کہنگی' اور رنگ و روغن کی دھندلاہٹ' انسان کو اداس کر دیتی ہیں۔ اور اس کے ذہن میں جذبات کا ایک سیلاب امڈ آتا ہے کہ زمانوں کے ہاتھوں کسی چیز کو دوام نہیں' اور انسان کی ہزار ہا سال کی

محنت و مشقت وقت کے ہاتھوں مٹ رہی ہے اور پھر یہ کہ یہ یادگاریں باقی رہ گئیں اور ان کو بنانے والے کہاں گئے؟ اور کبھی کبھی معاشرے ان خستہ عمارتوں کے گھیرے میں محدود دنیا سے کٹ کر ان ہی کی طرح ذہنی طور پر زوال پذیر اور خستہ ہو کر رہ گئے۔

ماضی کی یادگاروں کی حفاظت نے موجودہ دور میں بہت سے نئے مسائل بھی پیدا کر دیئے ہیں کیونکہ ایسی یادگاریں جو ایک قوم نے دوسری قوم پر فتح کی یاد میں تعمیر کرائیں' اب یہ یادگاریں ان ملکوں کے تعلقات میں رکاوٹ بنتی ہیں کیونکہ اس سے ایک قوم کو جہاں فخر کا احساس ہوتا ہے تو دوسری قوم احساس کمتری میں مبتلا ہوتی ہے۔ مثلاً نپولین کی تعمیر کردہ "فتح کی محراب" یا لندن میں "نیلسن کا ستون" اور ٹرا فلگر اسکوئر" یہ یادگاریں فرانسیسی و انگریز قوموں کے درمیان تلخ یادوں کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان یادگاروں کو مٹایا جائے تو یہ تاریخ سے انکار ہو گا۔ ان یادگاروں کا اثر اسی صورت میں زائل ہو سکتا ہے جب کہ تاریخ کا عوامی نقطہ نظر پیش کیا جائے کہ ماضی کی جنگیں اور ان جنگوں کی یادگاروں کا تعلق حکمران طبقوں کے مفادات سے تھا اور عوامی مفادات کا ان سے کوئی تعلق نہیں' لیکن ان کے علاوہ ماضی کی اکثر یادگاریں وہ ہوتی ہیں جن کا تعلق صرف ایک معاشرہ اور ملک سے ہوتا ہے اور وہ قوموں کے درمیان کوئی نفرت و عناد پیدا نہیں کرتیں۔

چونکہ ماضی کی یادگاریں قومی فخر اور عظمت کے احساس کو باقی رکھتی ہیں اور وہ یادگاریں بھی کہ جن کا تعلق عوام سے نہیں ہوتا مثلاً محلات' مقبرے' باغات اور بارہ دریاں وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ معاشرہ کی ملکیت ہو جاتی ہیں' اور معاشرے کے لئے ماضی کی علامت بن جاتی ہیں۔ اس لئے فاتح قوموں کا یہ دستور تھا کہ وہ مفتوح قوم کی یادگاروں کو منہدم کر کے ایک طرف اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتی تھیں تو دوسری طرف وہ مفتوح قوم کا رابطہ اور تعلق ماضی سے کاٹنا چاہتی تھیں تاکہ وہ حال کی تنہائیوں' میں تنہا رہ جائیں اور اپنا اعتماد کھو کر فاتح قوم کے زیر اثر آجائیں۔ اسی پس منظر میں عباسی دور میں طاق کسریٰ کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئی اور عہد برطانیہ میں ایک مرتبہ تاج محل مسمار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مگر جس طرح اہل یورپ نے ان کا' مایا' اور ایزٹک تہذیبوں کے آثاروں کو ختم کیا۔ اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

ماضی کو زندہ رکھنے میں دوسرا عنصر یادداشت کا ہوتا ہے کہ جس کے ذریعہ ماضی کے واقعات کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ انفرادی یادداشت کی ایک خاص حد ہوتی ہے اور معاشرہ کی اجتماعی یادداشت وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور اسی وجہ سے واقعات کی تفصیل اور شکل بدل جاتی ہے' اور یہی وہ پس منظر ہے کہ جس میں دیو مالائی قصے کہانیاں پیدا ہوتے ہیں۔

جب اس یادداشت کو تحریر کی شکل میں لایا جاتا ہے تو یہی تاریخ بن جاتی ہے اور اس طرح سے تاریخ کا ماضی سے گہرا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ تاریخ انسان کی اس خواہش کو پورا کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے وقت اور حدود سے باہر جو کچھ ہوا ہے اس سے واقفیت حاصل کرے کیونکہ تاریخ وقت کی حدود کو توڑ دیتی ہے اور ماضی کو حال سے ملا دیتی ہے، اس لئے ماضی کو یاد رکھنے میں یہ سب سے زیادہ مدد دیتی ہے۔

انسان کے لئے ماضی بڑا سہانا اور دلکش ہوتا ہے' اور اس کی یہ دوری اسے ہماری پہنچ سے اور دور کر دیتی ہے' اور پھر ہمارے تصورات و خیالات کی مدد سے ماضی کی دل آویز تصویر بنائی جاتی ہے۔ انسان ماضی کی اچھی اور خوشگوار باتوں کو تو یاد رکھتا ہے' مگر اس کے تکلیف دہ اور اذیت ناک لمحات کو بھلا دیتا ہے۔ تکلیف کو صرف حال میں محسوس کیا جاتا ہے' ماضی میں اس کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔

کیا ماضی قوموں کی زندگی اور اس کی تعمیر و تشکیل میں مدد دیتی ہے یا اس میں رکاوٹ بنتی ہے؟ لارڈ ایکٹن کے مطابق ماضی پر قابو پانا ضروری ہے تاکہ وہ ہمارے حال کو تباہ نہیں کرے۔ اس لئے ماضی کا تنقیدی جائزہ لے کر اس پر غلبہ حاصل کرنا چاہئے اور اسے اپنے اوپر بوجھ نہیں بننے دینا چاہئے کیونکہ ماضی کی صحیح معلومات ہی انسان کو اس کی زنجیروں سے آزاد کرا سکتی ہیں۔ نیٹشے اس سے بھی زیادہ ماضی کے سلسلہ میں تلخ ہے۔ اس کے نزدیک کوئی مصور اس وقت تک تصویر نہیں بنا سکتا' کوئی جنرل اس وقت تک فتح حاصل نہیں کر سکتا اور کوئی قوم اس وقت تک آزادی حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنے ماضی کو نہیں بھول جاتی - اگر وہ ماضی سے متاثر ہو گیا تو اس کی مصوری' فن تعمیر' مجسمہ سازی اور سنگ تراشی پایہ تکمیل کو پہنچی نظر آئیں گی اور یہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر کے رکھ دیں گی۔ اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے بورکھارڈٹ نے کہا تھا کہ اچھا ہوا کہ یونان کی مصوری اور سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے ختم ہو گئے ورنہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں تخلیقی کام انجام نہیں ہو پاتا۔

لیکن انسان ماضی سے چھٹکارا بھی نہیں پا سکتا۔ اس کی جڑیں ماضی میں گہری ہیں۔ اس کی روایات' اقدار اور اس کی سوچ و فکر کے تانے بانے ماضی سے منسلک ہیں' اور اگر اس کو اس کے ماضی سے کاٹ دیا جائے تو علم و فن اور تہذیب و ثقافت کی تمام روایات سے محروم ہو کر وہ خالی ذہن ہو جائے گا۔

لیکن ماضی کی یہ یادیں ہر ایک کے لئے خوشگوار نہیں ہیں۔ اس کا تعلق بھی معاشرہ کے طبقوں سے ہے۔ وہ طبقے جن کے پاس مادی وسائل تھے انہوں نے ماضی میں اچھا وقت گزارا

اور بعد میں انہیں کے خاندان اپنے اچھے دنوں کو یاد کرتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں ماضی کی خوشگوار یادیں باقی رہتی ہیں۔ جیسے کہ آخری عہد مغلیہ میں امراء کے قدیم خاندان اپنی شکستہ اور گرتی ہوئی حویلیوں میں تنگ دستی اور فاقہ زدگی کی حالت میں پرانی یادوں کے سہارے اپنے جھوٹے وقار اور شان کو باقی رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ یاد ان کے لئے خوشگوار بھی تھی کہ جس کے سہارے وہ تکالیف برداشت کرتے تھے اور زندہ رہتے تھے' اور ان کے لئے یہ قاتل بھی تھی کہ اس نے ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیا اور انہیں حال کی تبدیل ہوتی ہوئی حقیقتوں سے دور رکھا اور انہیں خستہ حویلیوں کے مانند بوسیدہ بنا کر آخرکار زمانہ سے نیست و نابود کر دیا۔

لیکن معاشرے کے وہ غریب' مظلوم اور کچلے ہوئے طبقے کہ جن کا کوئی ماضی ہوتا ہی نہیں' اور جن کے پاس ماضی کی خوشگوار اور سہانی یادوں کے بجائے تلخیاں اور اذیتیں ہوتی ہیں' ان کے لئے ماضی کوئی دلکشی نہیں رکھتا۔ ایک کسان خاندان کی زندگی ماضی میں نپی تلی اور ایک جیسے معمول سے گزری اس لئے اس کے خاندان میں کوئی ایسی یاد نہیں رہتی کہ جس پر وہ فخر کرے۔ اس لئے ماضی کی تہذیب و ثقافت ہو یا روایات ان کا تعلق حکمران طبقوں سے ہوتا ہے اور وہی اس کی خوشگوار یادوں کو یاد رکھتے ہیں۔

اور یہ حکمران طبقے تو اس حد تک آگے بڑھتے ہیں کہ جب ماضی ان کی پسند کے مطابق نہیں ہوتا تو یہ اسے تبدیل بھی کر دیتے ہیں۔ واقعات کی شکل بدل جاتی ہے' تاریخ کو مسخ کر دیا جاتا ہے' روایات کو نئی شکل دیدی جاتی ہے۔ مثلاً جب کسی ایسے حکمران خاندان کو کہ جس کا ماضی شاندار نہیں تھا' اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کا مسئلہ آیا تو خاندان کے جھوٹے شجرے ترتیب دے دیے گئے۔ وہ ایران کے قدیم خاندانوں ساسانی وکیانی سے منسلک ہو گئے۔ جب بھی ضرورت پیش آئی تو ان کے ظلم و جرائم کو چھپانے کے لئے درباری مورخوں کی خدمات لی گئیں اور جھوٹ کو اس انداز سے پھیلایا گیا کہ سچائی وقت کے دھندلکوں میں چھپ گئی اور جھوٹ روز روشن کی طرح دماغوں پر چھایا رہا۔

اگر ماضی کی شان و شوکت اور بڑائی قوموں کے دماغوں میں بیٹھ جائے تو یہ انہیں جنگ جو بنا دیتی ہے اور پھر وہ قوت و طاقت کے ذریعہ ماضی کی عظمت کو دوبارہ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انیسویں صدی میں جب جرمن قوم کے ماضی کو مورخوں اور دانشوروں نے ابھارا تو اس کے نتیجہ میں جرمنی میں نازی ازم اور فاشزم نے جڑ پکڑی اور جرمنی کو عظیم قوم بنانے کے جذبہ نے اسے تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا۔ ماضی کے زیر اثر یہی حال احیاء کی تحریکوں کا ہوتا

ہے جو پر تشدد راستہ اختیار کر کے معاشرہ کو تعصب و تنگ نظری کی طرف لے جاتی ہیں۔ ماضی کا یہ استعمال رجعت پرست طبقوں کے اپنے مفادات کے لئے ہوتا ہے' اس کے ذریعہ وہ حال کی ان تبدیلیوں کو جو ان کے خلاف ہوتی ہیں روکنا چاہتے ہیں۔ اس وقت وہ ماضی کو ایک مثالی دور کی حیثیت سے پیش کر کے اس کے احیاء کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ماضی کی واپسی ان کے تمام مسائل کا حل ہے۔ اس لئے لوگوں کے ذہن کو متاثر کرنے کے لئے ماضی کی ہر چیز کو دوبارہ سے لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ قدیم ناموں کو دوبارہ سے استعمال کیا جاتا ہے اور قدیم سیاسی و معاشی ڈھانچہ کو زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی مثال جدید تاریخ میں نپولین کی ہے کہ جس نے رومی عہد کے معاشرہ کو دوبارہ سے فرانس میں قائم کرنا چاہا' مارکس اس ذہنیت کے بارے میں لکھتا ہے کہ۔

"وہ ڈر اور جھجک کے ساتھ ماضی کی روحوں کو اپنی مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ ان کے پچھلے ناموں سے کام نکالتے ہیں۔ ان کے جنگی نعروں اور لباسوں کو اپناتے ہیں' تاکہ ماضی کی مقدس پوشاک میں اور مانگی ہوئی زبان کی مدد سے وہ دنیا کی تاریخ کے اسٹیج پر نیا منظر پیش کریں۔"

لیکن احیاء کی ان کوششوں کا انجام ہمیشہ المیہ کی شکل میں نکلتا ہے۔ مارکس اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

"ہیگل نے ایک جگہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسے واقعات اور ایسی ہستیاں جو دنیا کی تاریخ میں اہمیت کی مالک ہوں دوبارہ ظاہر ہوتی ہیں۔ یہاں وہ اتنا بڑھانا بھول گیا کہ پہلی بار المیہ کی شکل میں اور دوسری بار مسخرے پن کے روپ میں۔"

ماضی کے احیاء کی باتیں انہیں معاشروں میں کی جاتی ہیں جو کہ مسائل کا شکار ہوتے ہیں اور ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے انہیں ماضی کے احیاء کے ذریعہ لوگوں کو جھوٹی امیدیں دلائی جاتی ہیں اور معاشرہ کے محروم لوگ اسی امید و بیم کی حالت میں ظالم کے پنجوں میں جکڑے مدہوشی کے عالم میں بے حس رہتے ہیں۔

ماضی اور زمانہ حال دونوں ایک دوسرے سے باہم متصادم نظر آتے ہیں۔ اور اس کوشش میں نظر آتے ہیں کہ ایک دوسرے سے سبقت حاصل کریں۔ ماضی میں چونکہ وہ واقعات ہوتے ہیں جو کہ وقوع پذیر ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے ماضی کی ہیئت و شکل مکمل ہو چکی ہوتی ہے اور اس دور میں جو کچھ ہوا تھا جو ہو چکا ہوتا ہے اور مکمل ہوتا ہے' اس کے نتائج سامنے آچکے ہوتے ہیں' اس لئے مورخ کے لئے ماضی کا مطالعہ کرنا اور اس میں ہونیوالے واقعات کا تجزیہ کرنا

آسان ہوتا ہے۔ وہ تجزیہ کی روشنی میں ماضی کے واقعات کے بارے میں اپنی رائے دے سکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں حال ایک نامکمل عمل ہے اور ایک ایسی صورت حال کی تصویر ہے کہ جو تکمیل کی جانب جاری ہے۔ اس لئے حال کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی رائے دی جا سکتی ہے۔ حال کو ماضی پر اس لئے ضرور فوقیت دی جا سکتی ہے کہ ماضی کا جو ورثہ اسے ملتا ہے وہ اس میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے پاس ماضی کا ورثہ ہے اور وہ اس ورثہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور معاشرہ کو ترقی کی جانب لے جا سکتا ہے۔

لیکن حال کو ماضی سے بہتر ثابت کرنے کے لئے کچھ سیاسی وجوہات ہوتی ہیں کہ جن کے تحت ماضی کو برا کہہ کر حال کو بہتر ثابت کیا جاتا ہے۔ مثلاً سیاسی خاندانوں کے مطالعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہر نیا آنے والا حکمران خاندان پچھلے خاندان کے دور حکومت کو سیاہ ترین ثابت کرتا ہے اور اس عہد میں ہونے والے مظالم' برائیوں اور بدعنوانیوں کو ایک ایک کر کے سامنے لاتا ہے تاکہ وہ اپنے عہد اور دور حکومت کو ماضی کے مقابلہ میں بہتر اور خوش آئند ثابت کر سکے۔ دربار کے مورخ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ پرانے دور کو انتشار اور پراگندگی کا دور ثابت کریں۔ اسی ذہنیت کے تحت عباسی دور میں امیہ خاندان کی برائیاں اجاگر کی گئیں اور ان کے حکمرانوں کو نااہل ثابت کیا گیا۔ ہندوستان میں مغلوں نے سوری دور حکومت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور ان کے عہد کی اچھائیوں کو تسلیم نہیں کیا۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انہوں نے مغل تہذیب کو زوال پذیر قرار دے کر ہندوستانیوں کے سامنے انگریز حکومت کی نعمتوں اور برکتوں کو پیش کیا۔

یہ رویہ صرف حکمران خاندانوں کا ہی نہیں ہوتا بلکہ انفرادی حکمران بھی سابق حکمران کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس نے رعیت کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہیں کیا اور انہوں نے حکومت پر قبضہ کر کے عوام کو مظالم سے نجات دلائی ہے۔ اس لئے ہم عصر مورخوں کے ہاں خصوصیت سے یہ نقطۂ نظر پایا جاتا ہے جو ہر نئے آنیوالے حکمران کو پہلے والے سے بہتر ثابت کرتے ہیں۔

سیاسی انقلاب کی تاریخ میں بھی یہ نقطہ نظر کار فرما ہوتا ہے کہ انقلاب سے پہلے کی تاریخ کو تاریک یا جہالت کا دور کہا جاتا ہے تاکہ اس تقابل کے ذریعہ انقلاب کی خوبیاں اجاگر ہو سکیں۔

ماضی اور حال کے اسی تصادم میں حکمران طبقوں کے مفادات سامنے آتے ہیں جو اپنے مقاصد کے تحت ماضی کو مسخ کرکے پیش کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے جن ناجائز ہتھکنڈوں اور سازشوں کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کیا ہوتا ہے اس کا جواز وہ ماضی کی برائیوں میں تلاش کرتے ہیں اور عوام میں اپنی حکومت کو اس طرح سے جائز قرار دیتے ہیں کہ ان کی حکومت ماضی کی خرابیوں کے نتیجہ میں قائم ہوئی ہے۔

ایک دوسری صورت بھی ہوتی ہے کہ اگر ماضی کا دور حکومت' حال سے بہتر ہو اور سیاسی تبدیلی کے نتیجہ میں جو حکومت برسراقتدار آئی ہو وہ لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے ماضی کو مسخ کرکے پیش کرتی ہے اور حقائق کو چھپا کر کوشش کرتی ہے کہ لوگوں میں ماضی کے بارے میں اچھے تاثرات قائم نہ ہوں' کیونکہ دوسری صورت میں لوگ ماضی و حال کا مقابلہ کرکے حال کی تبدیلیوں سے مایوس ہو جاتے ہیں۔

لیکن سماجی و سیاسی انقلاب جن کا مقصد عوام کی بھلائی ہوتا ہے وہ حال کی تصویر یکسربدل دیتے ہیں' کیونکہ اس انقلاب کے نتیجہ میں جو عوامی اصلاحات ہوتی ہیں اس کے مقابلہ میں ماضی ان کے لئے سیاہ دور کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔

ماضی بہتر ہو یا خراب' دونوں صورتوں میں وہ حال کے لئے ایک چیلنج ہوتا ہے اور حال اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ماضی کے شکنجوں سے خود کو آزاد کرائے اور ماضی کو اس کی صحیح شکل میں پیش نہ کرے کیونکہ اگر حال لوگوں کی مصیبتوں' دکھوں اور مسئلوں کا حل تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو لوگ اس سے تنگ آکر ماضی کی شان و شوکت' اور بھول بھلیوں میں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس تصادم میں حال کی بقا اسی میں ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و وقت کے ساتھ معاشرہ کی ترقی میں حصہ لے۔

ماضی اور حال کے تصادم کے سلسلہ میں کولنگ وڈ نے فکر انگیز بات کہی ہے کہ وہ ماضی مردہ ہوتا ہے کہ جو حال کے مطابق نہ ہو' اور ایک ایسے ماضی کو تاریخ میں بیان کرنا فضول اور بیکار ہوتا ہے' لیکن ماضی کے وہ واقعات کہ جو حال کے عمل کو سمجھنے میں مدد دیں تو اس صورت میں ماضی زندہ ہو کر حال کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ جیسے سیزر ختم ہو گیا' مگر جن حالات نے سیزر کو ابھارا تھا' جو عمل اس سے سرزد ہوا تھا اس کی شکل مسولینی کی صورت میں دوبارہ ظاہر ہو گئی۔ اور یہ اسباب' وجوہات اور تاریخی عمل ہر دور میں رہیں گے۔ اسپی نوزا کے خیالات آج بھی مردہ نہیں وہ زندہ ہیں کیونکہ ان کی بنیاد پر آج بھی غور و فکر ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ ماضی جو کہ حال کے تقاضوں کے مطابق ہو وہ زندہ رہتا ہے اور تاریخ اسے حال میں شامل کر دیتی ہے۔

مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ اس ماضی کو تاریخ میں اس طرح بیان کرے کہ وہ زمانہ حال کے سوالات کا جواب دے سکے۔ وہ ماضی کو اس طرح پیش کرے کہ موضوع ماضی کا ہو مگر بیان حال کا۔

کارل وٹ فوگل
اور مشرقی مطلق العنانیت

کارل وٹ فوگل تقریباً 1897ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ مئی 1988ء کو نیویارک میں اس کی وفات ہوئی' 1930ء کی دہائی میں جرمنی کے سیاسی حالات کی وجہ سے یہ امریکہ میں ہجرت کر آیا' جہاں اس نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور کولمبیا یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے شعبہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا' یہ خصوصیت سے چین کی تاریخ کا استاد تھا' اور ہم عصر سیاست پر گہری نظر رکھتا تھا۔ وٹ فوگل خود کو مارکسسٹ کہتا تھا' لیکن سوویٹ یونین کے زبردست مخالفین میں سے تھا۔ وٹ فوگل کی مشہور کتاب "مشرقی مطلق العنانیت" (ORIENTAL DESPOTISM) 1957ء میں چھپی۔ اس کے ذریعہ اس نے روس پر حملہ کرتے ہوئے اسے ایشیائی طرز کی مطلق العنان حکومت قرار دیا۔ اس نے مشرقی ممالک کے بارے میں جو نظریات پیش کئے ہیں اس کی وجہ سے اس کی کتاب بحث و مباحثہ کا مرکز بن گئی اور تاریخ و سیاست کے عالموں نے اس کا جواب دیا۔

وٹ فوگل کے نظریہ کے مطابق مشرقی ممالک میں مطلق العنانیت کی وجہ یہ تھی کہ حکومتیں ذرائع آب پاشی اور زراعت پر مکمل طور پر تسلط رکھتی تھیں۔ مارکس نے بھی اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ ذرائع آب پاشی پر قبضہ کی وجہ سے کس طرح سے مشرقی حکومتوں کو معاشرہ پر تسلط کا موقع ملا۔ لیکن وٹ فوگل نے مارکس سے ہٹ کر مشرقی مطلق العنانیت کی جڑیں آب رساں معاشرے میں تلاش کی ہیں۔ ایسے معاشرہ میں نوکر شاہی اور انتظامیہ پانی کے ذرائع پر قابض ہو کر اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال کرتی تھیں۔ ایسے ملکوں میں کہ جہاں پانی کی مقدار بہت ہو وہاں حکومت پانی اور اس کے ذرائع پر کنٹرول نہیں کرتی' مگر ان ملکوں میں کہ جہاں پانی وافر مقدر میں نہ ہو وہاں پانی کی تقسیم کی ذمہ داری حکومت سنبھال لیتی تھی' اس لئے ایسے علاقوں میں آب رساں معاشرہ کی تشکیل ہوتی تھی اور معاشرہ کی بقا کا سوال اس پر ہوتا تھا کہ پانی کی تقسیم کیسے ہو' کس انداز پر ہو' اور کس طرح سے ہو۔

کیونکہ ان معاشروں میں زراعت کا دارومدار پانی پر ہوتا تھا اس لئے ضرورت کے مطابق پانی میسر آنے سے زراعت و فصلوں کی کاشت یا تو بہتر ہوتی تھی یا تباہ ہو جاتی تھی۔ ان حالات میں حکومتوں کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ زراعتی پیداوار سے پہلے اس پر توجہ دیں کہ زراعت کے لئے پانی وافر مقدار میں ہو' اور آب پاشی کے ان ذرائع کو فروغ دیں اور انہیں قائم کریں کہ جن کی وجہ سے کاشت کاری ہو سکے۔

آب رسانی کے طریقوں کو قائم کرنے اور انہیں چلانے کے لئے انتظامیہ کی ضرورت ہوتی تھی کہ جو وسیع اختیارات رکھتی ہو' اس لئے زراعت سے پہلے نوکر شاہی پیدا ہوتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ سیلاب پر قابو پانے' قحط سے بچاؤ کے انتظامات کرنے' اور خشک سالی کے زمانے میں پانی کو محفوظ کرنے کے لئے بھی انتظامیہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس طرح یہ انتظامیہ مقامی سطح پر بھی ہوتی تھی اور مرکزی سطح پر بھی۔ مرکزی انتظامیہ کے وسیع اختیارات آب رساں معاشرہ کی ضرورت کے تحت پیدا ہوتے تھے تاکہ وہ اس نظام کو قائم رکھ سکے۔ اس لئے انتظامیہ کی بنیاد اس پر ہوتی تھی کہ وہ نگہداشت کرے' دیکھ بھال کرے' اور کام کو موثر طریقے سے چلائے۔ وہ صاحب جائداد نہیں ہوتی تھی۔ فوجی انتظامیہ کی کامیابی کا دارومدار محض اس بات پر ہوتا تھا کہ نظام کو کس طرح برقرار رکھے اور کس طرح عوام کو ضرورت کے مطابق غذا ملتی رہے۔ اس لئے نوکر شاہی آب رساں معاشرہ میں انتہائی طاقت ور اور وسیع اختیارات حاصل کر لیتی تھی' اور معاشرہ سے ان تمام عناصر کو ختم کر دیتی تھی جو کہ تبدیلی لانے والے ہوتے تھے۔ اس لئے اس معاشرہ میں ٹھہراؤ اور سکوت ہوتا تھا اور تبدیلی کے تمام راستے بند ہو جاتے تھے۔

آب رساں معاشرہ میں حکومت کیوں مطلق العنان بنتی تھی اس کی وجوہات کیا تھیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وٹ فوگل کہتا ہے کہ۔

ریاست پیداوار کے اہم ذرائع پر قابض ہو جاتی تھی جن میں آب رسانی کے ذرائع شامل تھے۔ اس طرح ریاست اس فرد یا جماعت جس کا تعلق زراعت سے ہو' کے خلاف اقدامات اس طرح سے کرتی کہ ان کا پانی بند کر دیتی تھی جو ان کی فصلوں کو تباہ کر دیتا تھا' اور وہ یا تو حکومت سے سمجھوتہ کرکے اس کے وفادار ہو جاتے تھے یا ان کی طاقت ٹوٹ جاتی تھی اور وہ ناکارہ و کمزور ہو کر ختم ہو جاتے تھے۔ اس طرح ریاست کی مرضی کے بغیر پیداوار ناممکن ہو جاتی تھی۔

اس نظام کے تحت منظم اور تربیت یافتہ مخبری کا نظام پیدا ہوتا تھا جس کے ذریعہ آبادی پر

اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ ذرائع آمدورفت' ڈاک کا انتظام' شاہراہیں' اور پانی کے راستوں پر قبضہ رکھتی تھی جہاں جگہ جگہ چنگی ناکہ پر تاجروں کو ٹیکس ادا کرنے ہوتے تھے۔

ریاست ایک تربیت یافتہ مسلح فوج رکھتی تھی جو مرکز کے ماتحت ہوتی تھی' جب کہ عوام کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

ریاست ٹیکسوں اور بیگار کے ذریعہ آب پاشی کے انتظام کو قائم رکھتی تھی اور سرکاری عمارتیں تعمیر کراتی تھی۔ ٹیکسوں اور بیگار کا بوجھ غریب عوام پر ہوتا تھا' اور انتظامیہ جب چاہتی تھی ٹیکسوں کو بڑھا دیتی تھی۔

ریاست سے علیحدہ کوئی مضبوط معاشی ادارے نہ پیدا ہو سکتے تھے اور نہ ترقی کر سکتے تھے۔ آزاد تجارت پر پابندیاں ہوتی تھیں' صنعت و حرفت پر ریاست کا تسلط ہوتا تھا۔ تاجر اور صاحب جائداد ریاست کے وفادار اور تابع ہوتے تھے کیونکہ انہیں جرمانوں اور جائداد کی ضبطی کا خوف رہتا تھا۔ اس لئے وہ اپنی دولت چھپا کر رکھتے تھے اور اسے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس معاشرہ میں ایسا کوئی دولت مند طبقہ وجود میں نہیں آیا کہ جو ریاست کی طاقت کو چیلنج کر سکے یا اس کا توازن بگاڑ سکے یا ایسا معاشی نظام پیدا کر سکے کہ جو آب رساں معاشرہ سے جدا ہو۔

ریاست اپنی مطلق العنانیت کی حمایت مذہب سے حاصل کرتی تھی اور خود کو الوہی مظہر قرار دے کر اپنی ذات کو براہ راست خدا سے ملا دیتی تھی اس لئے اس کی ذات سے بغاوت کرنا خدا اور مذہب سے بغاوت ہو جاتی تھی۔ اس طرح وہ ایسے تمام فرقوں اور مسلکوں کو دبا دیتی تھی کہ جو مقبول عام ہوتے تھے کیونکہ اس سے ریاست کو اور اس کے اس مذہب کو خطرہ ہوتا تھا' جس کی وہ سرپرستی کرتی تھی۔

مطلق العنان حکومتوں میں لوگوں کی فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ کے لئے کچھ نہیں کیا جاتا تھا' بلکہ ریاست لوگوں کی آمدن سے زائد مقداران سے لے کر ہضم کر لیتی تھی۔

ریاست اپنے اداروں کے ذریعہ تشدد و سختی کے ساتھ روشن خیالی' آزادی' اور تنقیدی نظریات و خیالات کو کچل دیتی تھی۔ ہر شخص کو اپنے عہدے اور دولت کے باوجود غیر محفوظ ہونے کا احساس ہوتا تھا اس میں کسی بھی جماعت اور گروہ کو آزادانہ اور خود مختارانہ کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی تاکہ حکومت کی طاقت کسی بھی طرح محدود نہ ہونے پائے۔

اس قسم کی مطلق العنانیت ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئی کہ جہاں اس قسم کی نجی

جائداد تھی کہ جس پر لگان و مالیہ ادا کیا جائے' اس میں معاشی دولت سے تو فائدہ اٹھایا جاتا تھا' مگر اس کے ذریعہ سیاسی طاقت حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس میں طاقت کا مرکز حکومتی ادارے ہوتے تھے اور یہ حکمران طبقے اس لئے ہوتے تھے کہ حکومت کو ان کی ضرورت ہوتی تھی' لیکن اس کے علاوہ وہ کسی قسم کے سماجی و معاشی اختیارات کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔

وٹ فوگل اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ آب رسانی کے معاشروں میں جس میں مطلق العنانیت ہوتی تھی اس سے وہ معاشرے بھی متاثر ہوئے کہ جو آب رساں معاشرے نہیں تھے۔ یہ نظام اس لئے پھیلا کر اس کے ذریعہ حکمران کو بے انتہا اختیارات مل جاتے تھے۔

آب رساں معاشروں میں جن ملکوں کو شامل کیا جا سکتا ہے ان میں قدیم مصر' عراق' شام' روم' بازنطینی سلطنت' عرب خلافت' اسلامی ہسپانیہ' عثمانی سلطنت' ہندوستان' چین' اور جنوبی امریکہ میں پوبلو انڈین' ہنگا اور قدیم ہوائی شامل ہیں۔

وٹ فوگل کے ان نظریات پر کافی اعتراضات کئے گئے' خصوصیت سے مشرقی مطلق العنانیت کی اصطلاح پر کافی لے دے ہوئی' اور کہا گیا کہ یہ اصطلاح مغربی ذہن کی پیداوار ہے' جو کہ مشرق اور مغرب کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹے رکھتے ہیں اور یہ کہ مطلق العنانیت صرف مشرق ہی میں پیدا ہو سکتی ہے مغرب میں نہیں۔ مانٹسکو نے بھی مشرقی ملکوں میں طرز حکومت کا ذکر کرتے ہوئے مشرقی مطلق العنانیت کو خوب اچھالا ہے اس لئے وٹ فوگل کے ہاں بھی اس کی بنیاد سائنسی دلائل پر نہیں بلکہ مغربی تعصب پر ہے۔

مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ مطلق العنان بادشاہ کی ذات میں تمام اختیارات سمو دیے جاتے تھے اور دوسرے تمام اداروں کے اختیارات سلب کر لئے جاتے تھے تو یہ دلیل مبالغہ آمیزی پر مبنی نظر آتی ہے کیونکہ ہر معاشرہ میں طاقت کا استعمال کسی نہ کسی مرحلہ پر جاکر محدود ہو جاتا ہے اور ایسے ادارے ہوتے ہیں جو اسے چیلنج کرتے ہیں۔ چنانچہ مشرقی مطلق العنانیت کا تصور اس لئے پیدا کیا گیا تاکہ مشرق کو مغرب کے مقابلہ میں ایک علیحدہ خصوصیت دی جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ مشرق ہر طرح سے مغرب سے علیحدہ ہے۔

پال ہرسٹ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ وٹ فوگل استدلال پیش کرتے ہوئے ہر بات کو فرض کرتا ہے کہ ایسا ہوا ہو گا۔ وہ کسی بات کو ثابت نہیں کرتا ہے بلکہ فرض کر لیتا ہے کہ آب رسانی کے ذرائع ایک نظام کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر ایک انتظامیہ کے ذریعہ اس نظام کو چلایا جاتا ہے۔

لیچ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ سری لنکا کا معاشرہ آب رساں معاشرہ تھا' لیکن

تاریخ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سنہالا کی قدیم ریاست مطلق العنان تھی۔ اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ سری لنکا میں آب رسانی کے ذرائع کی وجہ سے کبھی کوئی ریاستی نظام پیدا نہیں ہوا' بلکہ یہ ریاستی نظام ارتقائی طور پر ایک ہزار چار سو سال کی مدت میں پورا ہوا۔ سری لنکا میں اگرچہ محلات و مندروں کی تعمیر ہوئی' اور اس میں سرمایہ اور لوگوں کی محنت شامل تھی لیکن کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ محنت پر نوکر شاہی کا تسلط تھا۔ ان تعمیری کاموں' ان کی مہارت اور فنی خوبیوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ بدھ خانقاہ سے تعلق رکھتے تھے اور حکومت کے ملازم نہیں تھے۔

لیچ نے سری لنکا میں کینڈی حکومت کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہاں جاگیردارانہ نظام تھا کہ جس میں حکومت نے زمینیں جاگیرداروں کو دیدی تھیں۔ بادشاہ اگرچہ مطلق العنان تھا اور معاشرہ آب رسانی کے ذرائع پر قائم تھا' لیکن زراعتی نوکر شاہی کا وجود نہ تھا' اور نہ لوگ آب رساں نظام کے ماتحت تھے۔

ایبر ہارڈ نے چین کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ قرون وسطی میں چین میں آب پاشی کا نظام انتہائی ناقص تھا اور حکومت میں کوئی ایسا وزیر نہیں تھا کہ جس کے ذمہ یہ کام ہو۔ آب رسانی کا زیادہ تر کام مقامی طور پر ہوا' کہ جہاں جہاں اس کی ضرورت تھی۔ پانی کی تقسیم کا کام چین میں حکومت نہیں بلکہ گاؤں کے سربر آوردہ لوگ کیا کرتے تھے۔

وٹ فوگل نے ہندوستان کے بارے میں جو مثالیں دی ہیں' اس پر بھی عرفان حبیب اور دوسرے لوگوں نے اس کا جواب دیا ہے۔

وٹ فوگل کا نظریہ مشرقی مطلق العنانیت مشرق کے اکثر دانشوروں کی اس ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب' مغرب' اور ان دونوں کا آپس میں ملاپ ناممکن ہے۔

نو آبادیاتی نظام سیاست اور کاہل اقوام کا تصور

جب یورپی اقوام نے نو آبادیاتی نظام کی بنیاد ڈالی اور ایشیا' افریقہ' امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں اپنے اقتدار کو مستحکم کیا تو انہیں اپنے سیاسی اقتدار اور سماجی و معاشی برتری کے لئے اخلاقی جواز کی تلاش ہوئی کہ جس کی بنیاد پر وہ نو آبادیات اور ان کے باشندوں کے استحصال کو جائز قرار دے سکیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے "سست اور کاہل مقامی باشندے" کا نظریہ پیش کیا۔ جس کے تحت اس خیال کو عام کیا کہ نو آبادیات کے مقامی باشندے بنیادی طور پر سست اور کاہل ہیں۔ انہیں کام کرنے سے کوئی شغف نہیں ہے۔ بے کار رہ کر وقت گزارنا ان کا مشغلہ ہے۔ اس لئے ایسے لوگ جو کام سے جی چراتے ہوں' جن میں کام کرنے کی صلاحیت اور لگن نہ ہو' ایسے لوگوں میں نہ تو حکومت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ لوگ تہذیب و تمدن اور کلچر میں کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس مفروضہ کی بنیاد پر یورپی اقوام نسلی طور پر ان سے برتر اور با صلاحیت قرار پائیں۔ ترقی یافتہ' مہذب' اور متمدن اقوام کی حیثیت سے ان کی یہ ذمہ داری ٹھہری کہ سست اور کاہل مقامی باشندوں پر حکومت کریں۔ ان کے ملکوں کے ذرائع کو استعمال کریں اور ان سست و کاہل باشندوں سے جبر و تشدد کے ذریعہ کام لیں۔ اس طرح یورپی اقوام کو مقامی باشندوں کا استحصال کرنے کا جواز مل گیا کہ وہ سختی کے ساتھ انہیں اپنے دائرہ اقتدار میں رکھیں۔

جب کسی قوم کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سست اور کاہل ہے تو اس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اسے کام سے محبت نہیں' کام کرنے کی خواہش نہیں اور کام کرنے کے دوران اس میں توانائی' جوش اور لگن نہیں ہوتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی پوری قوم فطری طور سست و کاہل ہوتی ہے یا چند طبقے؟ اور جو طبقے سستی اور کاہلی کا شکار ہوتے ہیں ان کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔ کیا یہ بھی فطری طور پر سست پیدا ہوئے ہیں یا سماجی و معاشرتی نظام انہیں ایسا بنا دیتا ہے؟ ظاہر ہے کوئی

قوم یا قوم کے سماجی و معاشرتی طبقے پیدائشی طور پرست و کاہل نہیں ہوتے۔ بلکہ حالات اور معاشرہ کا نظام، اس کے کردار، عادات و فضائل، اور عمل کی تشکیل کرتے ہیں۔ جاگیروارانہ معاشرہ میں جہاں تمام قوت و طاقت ایک طبقہ میں جمع ہو جاتی ہے، اور دوسرے لوگوں کو محض اس قدر ملتا ہے کہ بمشکل اپنی زندگی گزار سکیں، تو اس صورت میں محض روزی کے حصول کے لئے ان کی تمام توانائی صرف ہو جاتی ہے جو ان کی صلاحیتوں کو ختم کرکے رکھ دیتی ہے۔ اس صورت میں اسے کام سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہتی، یہی صورت حال فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی ہوتی ہے۔ وہ جن اشیاء کو پیدا کرتا ہے وہ خود ان کو اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا، اس صورت میں اس کے اور کام کے درمیان کوئی قریبی رشتہ پیدا نہیں ہوتا اور کام سے اس کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور وہ محض ایک مشین بن جاتا ہے جو کام کرنے کے لئے حرکت کرتی ہے۔

الاتاس نے کاہل مقامی باشندے کا مفروضہ میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"آدمی فطری طور پر ست اور کاہل نہیں ہوتا، جب وہ اپنی بنیادی ضرورتیں مہیا کرلیتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ فالتو اشیاء بھی حاصل کرے، اور تحفظ کی حالت میں ان سے لطف اندوز ہو۔ لیکن اگر ظلم کی مضبوط گرفت اس سے اس کی کمائی چھین لے اور اس کو اس کے بدلہ میں کچھ بھی نہ دے تو پھر وہ سست اور کاہل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنی آج کی ضروریات حاصل کرتا ہے۔ یہ بے حسی نسلوں میں جاکر دائمی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ یہ ان کی عادت بن جاتی ہے۔"

ہر اس معاشرہ میں جہاں جسمانی محنت کرنے والے کو حقارت سے دیکھا جاتا ہو، وہاں کسان، دست کار، کاریگر، اور ہنرمند کا سماجی مرتبہ نچلی سطح پر متعین ہو جاتا ہے۔ اور اسے ذات اور موروثی طور پر پیشوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے بعد سے ان ذاتوں اور پیشوں والوں کے لئے ترقی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کے باوجود سماجی حصار سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اس لئے اگر معاشرہ افراد کو ان کی صلاحیت کے مطابق با مقصد اور مفید کام نہیں دے گا، تو پھر اس کے ہاں بے کار افراد ہی پیدا ہوں گے۔ رزال (RIZAL) نے کہا ہے کہ "سستی پسماندگی کا سبب نہیں ہوتی، بلکہ یہ پسماندگی اور انتشار کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

یورپی اقوام نے جب ایشیا کے ملکوں کو نوآبادیات بنایا تو یہاں کا معاشرہ جاگیردار معاشرہ تھا۔ اس معاشرہ میں حکومت اور اقتدار کے مالک طبقے اپنی خدمت اور ذاتی کاموں کے لئے

لاتعداد ملازم اور خدمت گار رکھا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ذمہ صرف ایک مخصوص کام ہوا کرتا تھا۔ ہاتھ سے کام کرنا' وزن اٹھانا' یا محنت کرنا جاگیردار طبقے کے لئے معیوب ہوا کرتا تھا۔ اس لئے اگر یورپی اقوام نے اس طبقہ کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا کہ یہ سست و کاہل' نکمے اور کام چور تھے تو یہاں تک تو درست تھا' لیکن یہ تاثر پورے معاشرے' اور دوسرے طبقوں کے لئے درست نہیں تھا۔ کیونکہ دوسرے طبقے جن میں کسان' کاشت کار' ہنرمند' دست کار' کاریگر اور مزدور تھے۔ انہیں اپنی روزی کے حصول کے لئے سخت محنت و مزدوری کرنی پڑتی تھی' اور یہ انہی محنتی اور کام کرنے والے طبقوں کی محنت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ماضی میں شاندار تخلیقات کیں جن کی یادگاریں عظیم عمارتیں' خوبصورت اشیاء' اور نادر و نایاب دست کاری کے نمونے ہیں جو دنیا کے عجائب گھروں میں محفوظ ان کی محنت و صلاحیت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

الاتاس نے فلپائن' ملایا اور انڈونیشیا میں اسپین' برطانیہ اور ہالینڈ کے نوآبادیاتی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس مفروضہ کا تاریخی اور عمرانی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ چونکہ نوآبادیات کے لوگ کالونیل کیپٹل ازم (نوآبادیاتی سرمایہ داری) کے پیداواری نظام میں ان کا آلہ کار نہیں بنے' اس لئے انہوں نے مقامی باشندوں کو سست اور کاہل کہا۔ ان کے نزدیک محنتی کا مطلب یہ تھا کہ انسان عظمت سے گر کر نچلی سطح پر نوآبادیاتی سرمایہ داری کے لئے کام کرے اور اس کی پیداوار میں اضافہ کرے۔ جب اس نے اس سے انکار کیا تو اس جرم کے نتیجہ میں اسے سست اور کاہل کہا گیا۔

اس لئے سستی اور کاہلی کا تصور ایک اضافی تصور ہے جو یورپی اقوام نے اپنے نقطہ نظر سے پیش کیا۔ مثلاً ہندوستان میں انگریزوں نے ہر خطہ کے لوگوں کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھا۔ جن اقوام نے ان کی مزاحمت کی وہ شورش پسند اور باغی کہلائے۔ جنہوں نے ان کی پیداوار میں اضافہ سے انکار کیا وہ نشہ باز اور کام چور ٹھہرے اور جنہوں نے ان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا وہ بزدل اور نرم مزاج قرار پائے۔

اس کی کئی مثالیں ہیں کہ جب مقامی باشندوں نے یورپی اقوام کے لئے کام نہیں کیا تو انہوں نے ان کی جگہ دوسری قوموں کے لوگوں کو بحیثیت قلی اور مزدور کے بلایا۔ جیسے افریقہ کے ملکوں اور جزائر غرب الہند میں ہندوستان سے مزدوروں کو لے جایا گیا اور وہاں ان سے نچلے درجہ کے کام کرائے گئے۔ وہ یہ کام کرنے پر اس لئے مجبور ہوئے کہ ان کی کوئی جڑیں ان ملکوں میں نہیں تھیں اس لئے ان کی بقاء اس میں تھی کہ وہ ہر قسم کا کام محنت سے کریں۔

امریکہ میں ابتداء میں یورپ کے آباد کاروں نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ ریڈ انڈین سے اپنے کھیتوں اور کانوں میں کام کرائیں لیکن جب انہوں نے مزاحمت کی تو اس کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں افریقہ سے غلاموں کو لایا گیا اور ان سے تشدد کے ذریعہ کام کرایا گیا۔ کیونکہ انہیں بحیثیت غلام کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ملایا میں جہاں کسان کھیتوں میں کام کرتا تھا اور خالی وقت میں وہ دوسرے کاموں میں مصروف رہتا تھا اس نے بھی نو آبادیاتی نظام میں ان کی فیکٹریوں اور کانوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے یہ ان کی نظروں میں سست ٹھہرے اور ان کے بجائے ہندوستان سے مزدوروں کو بلایا گیا۔ نو آبادتی نظام کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد انہوں نے تمام اعلیٰ اختیارات خود سنبھال لئے اور مقامی لوگوں کو محض آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ اس لئے جب ایک قوم کے تمام اختیارات چھین لئے جائیں تو اس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتیں خود بخود کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم رکھنے کی خاطر تشدد سے کام لیا۔ ہر قسم کی مزاحمت کو سختی سے کچل دیا اور ذرا سے شبہ پر لوگوں کو اذیتیں دیں۔ اس لئے ایسے ماحول میں مقامی لوگ ڈرے اور سہمے ہوئے رہے اور اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار نہیں لا سکے۔

درحقیقت نو آبادیاتی نظام میں سست اور کاہل طبقہ ان یورپیوں کا تھا جو ان ملکوں میں بحیثیت حکمران کے آئے تھے۔ اپنی سماجی اور سیاسی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان یورپی خاندانوں نے اپنی ذاتی آسائش اور آرام کی خاطر لاتعداد ملازم رکھے ہوئے تھے جو ان کی ہر ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ دوسرے ان کا کام کریں اور اگر وہ اس سے انکار کرتے تو یہ اسے سستی اور کاہلی سے تعبیر کرتے تھے۔ مثلاً ہندوستان میں ایک یورپی خاندان کی خدمت کے لئے کم سے کم 57 ملازم اور خدمت گار ہوا کرتے تھے جن میں خانساماں، باورچی، درزی، بیرا، مالی، قلی، کوچ مین، بہشتی، حقہ بردار، چوکیدار اور بھنگی ہوا کرتے تھے۔ ایک معمولی فوج کا کپتان جب کسی مہم پر جاتا تھا تو اس کے ساتھ سائیس، نائب سائیس، حجام، دھوبی، اور 15 قلی سامان اٹھانے کے لئے ہوتے تھے۔

اس لئے سست اور کاہل مقامی باشندے کا مفروضہ محض نو آبادیات کے استحصال کے لئے پیدا کیا گیا۔ ورنہ ان نو آبادیات سے جو دولت لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ یورپ جاتی رہی وہ یہاں کے مقامی باشندوں کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہی ہوا کرتی تھی۔

محمد حبیب
تاریخ کے نظریات

پروفیسر محمد حبیب علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہے اور انہوں نے ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ پر تحقیقی کام کیا۔ ان کا عہد ہندوستان کی سیاست کا اہم زمانہ ہے۔ جب کہ ایک طرف ہندو اپنی انتہا پسندی کا مظاہرہ کر رہے تھے تو دوسری طرف مسلمان مذہبی بنیاد پرستی کا شکار تھے۔ لہٰذا ان دو رجحانات کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی کی جنگ جو انگریزوں سے لڑی جا رہی تھی وہ کمزور ہو رہی تھی اور ہندو مسلم مذہبی تعصبات ہندوستان کی متحدہ قومیت کی بنیادوں کو توڑ رہے تھے۔ ان حالات میں پروفیسر حبیب نے جب ہندوستان کی تاریخ پر تحقیق کی تو ان کا بنیادی نقطہ نظریہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کو قومی اور سیکولر نقطہ نظر سے پیش کیا جائے اور تاریخ کے ذریعہ جو مذہبی تعصبات اور تنگ نظری پیدا ہو گئی ہے اسے دور کیا جائے تاکہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی ہو اور وہ متحد ہو کر قومی آزادی کے لئے جدوجہد کر سکیں۔

تاریخ نویسی میں پروفیسر حبیب کی ہمدردیاں ہندوستان کے کچلے اور مظلوم عوام کے ساتھ تھیں اس لئے وہ سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس عہد کی ثقافتی تاریخ کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کی بارے میں جن خیالات کو پیش کیا' اور تاریخ کی تعبیر جس انداز سے کی' اس نے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ایک نیا زاویہ دیا۔

ہندوستان میں اسلام ابتداء میں عربوں کے ذریعہ آیا مگر اسلام کی طاقت و شکل ترکوں کے ذریعہ آئی جنہوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں ہندوستان میں فتوحات کے ذریعہ اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس لئے یہ سوال اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ آخر ترک کیوں ہندوستان میں کامیاب ہوئے' اور انہوں نے راجپوت حکمرانوں کو شکستیں دے دیں حالانکہ راجپوت بہادری اور شجاعت میں ان سے کسی بھی صورت میں کم نہ تھے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ترکوں کی کامیابی کی وجہ فوجی نہیں' بلکہ سماجی حالات

تھے۔ گیارھویں صدی کا ہندوستان ایک ایسا ملک تھا کہ جس میں قلعہ بند شہر اور قصبے تھے اور ان پر طبقہ اعلیٰ کا قبضہ تھا' جب کہ معاشرے کے نچلے طبقے شہر اور قصبہ کی سہولت سے محروم تھے اور وہ اس بات پر مجبور تھے کہ وہ غیر محفوظ اور کھلے گاؤں میں رہیں' یا شہر کی فصیل سے باہر اپنی بستیاں آباد کریں۔ انہیں شہر میں داخلہ صرف کام کرنے کی غرض سے ملتا تھا' مگر ان کی رہائش طبقہ اعلیٰ سے دور ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ان میں اور حکمران طبقوں میں دوری تھی۔ ہم آہنگی اور ملاپ کے کوئی رشتے نہیں تھے کہ جو ان طبقوں میں افہام و تفہیم پیدا کریں اس لئے نچلے طبقوں کے افراد کچلے اور مظلوم لوگ تھے اور جب ترک حملہ آور آئے تو انہوں نے ان کا ساتھ دیا' اور ان کی مدد کے بغیر حکمران طبقے اپنے قلعوں اور محلات کی حفاظت نہیں کر سکے۔

اس لئے ہندوستان میں غوریوں کو جو فتوحات ہوئیں' اس کے پس منظر میں ہندو معاشرہ کا جمود تھا اور یہ جمود نہ صرف ٹوٹنے کا خواہش مند تھا بلکہ لوگ تبدیلی چاہتے تھے۔ اس لئے جب ترکوں نے فتوحات کے بعد شہروں پر قبضہ کر لیا اور فصیلوں سے باہر رہنے والوں کو اس بات کی اجازت دیدی کہ وہ شہر کے اندر رہائش اختیار کریں تو اس نے شہری زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا' اور محنت کشوں کی سرگرمیوں نے تجارتی اور صنعتی زندگی کو فروغ دیا۔ اس لئے نچلے طبقے کے لوگوں نے ترکوں کی حکومت کو مضبوط کرنے میں مدد دی اور ہندو قانون کے مقابلہ میں کہ جس میں انہیں ہر مراعات سے محروم کر دیا گیا تھا انہوں نے اسلامی شریعت کو پسند کیا کہ جس نے ان کی موجودگی کو شہروں میں برداشت کیا۔ یہ اس طبقہ کی طاقت تھی کہ انہوں نے 5 سال تک حکومت کو مضبوط رکھنے میں مدد دی اور اسے تمام انقلابات سے محفوظ رکھا۔ یہ انہیں لوگوں کی جرت و ہمت تھی کہ منگولوں کی تین نسلیں پے در پے حملوں کے باوجود ہندوستان کے شہروں پر قابض نہیں ہو سکیں' کیونکہ ہندوستانی عوام اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ان حملہ آوروں سے لڑ رہے تھے۔

ترکوں اور غوریوں کے حملوں اور فتوحات کے نتیجہ میں ہندوستان میں بڑا سماجی اور معاشی انقلاب آیا کیونکہ ملک کی صنعتی اور معاشی قوتیں اس کے لئے صدیوں سے تیار تھیں مگر ان کا راستہ ذات پات کے نظام اور ٹھاکر فوجی نظام نے روک رکھا تھا۔ جب ان حملوں کے نتیجہ میں یہ ڈھانچہ ٹوٹا تو وہ عوامی قوت و طاقت جو صدیوں سے خوابیدہ تھی وہ بیدار ہوئی اور تھوڑے ہی وقت میں ہندوستان کے معاشرے میں معاشی و معاشرتی تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ اس مرحلہ پر سوائے راجا' رائے' اور ان کے حامیوں کے' سب نے اس نئے نظام کو تسلیم کر لیا اور اس نظام کے خلاف مزاحمت کی تمام تحریکیں ایک جادوئی اثر کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ غوریوں

اور ترکوں کی فتوحات کو اگر عالمی تاریخ کے پس منظر میں اور غیر فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فتوحات ہندوستان کے شہروں کے مزدوروں، محنت کشوں اور دست کاروں کا ایک انقلاب تھا۔ اس انقلاب نے ہندوستان کے شہر کی پوری زندگی بدل کر رکھ دی اور یہ شہر صنعت و حرفت اور دست کاری کا مرکز بن گئے جس نے معاشرے میں خوش حال اور فارغ البالی کو پیدا کیا۔

مختصراً" پروفیسر حبیب کے خیالات یہ ہیں۔

(1) ہندوستان میں ترکوں کی فتوحات سے پہلے محنت کش طبقہ شہروں سے باہر رہا کرتا تھا۔

(2) ان کے لئے ہندو قانون سے زیادہ اسلامی شریعت فائدہ مند رہی کیونکہ اس میں زیادہ جمہوری عناصر تھے۔

(3) غوری فتوحات نے ایک نیا سماجی نظام تشکیل دیا جو کہ ہندوستانی معاشرہ کی ذات پات کے خلاف تھا۔

(4) ترکوں کی سلطنت کی وسعت اور ان کی حکومت کی بقا اسی وجہ سے ممکن ہوئی کہ کچلے ہوئے اور نچلے طبقوں نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔

(5) یہ انقلاب ایک مرحلہ تھا کہ جس نے بہتر معاشرے کے قیام میں مدد دی۔ لیکن محض انقلاب ذرائع پیداوار اور پیداواری تعلقات میں بنیادی تبدیلیاں نہیں لاتے اور نہ ہی استحصال شدہ طبقوں کو حکمران طبقوں میں تبدیل کرتے ہیں اس لئے ترکوں کا انقلاب دراصل دو حکمران طبقوں کے درمیان مقابلہ کے نتیجہ میں وجود میں آیا۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس انقلاب نے کوئی عوامی حکومت قائم کر دی ہو یا حکمران طبقوں کے مفادات کو ختم کر دیا ہو فرق صرف یہ تھا کہ ترک حکمران طبقے ہندوستان کے ٹھاکروں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی پسند سوچ کے حامل تھے۔

ہندوستان کی تاریخ کا دوسرا اہم موڑ علاؤالدین خلجی کا دور حکومت ہے کہ جس کے عہد میں ہندوستان میں دیہاتی انقلاب آیا اور اس میں کسانوں اور کاشت کاروں کو اونچی ذات کے طبقوں کے تسلط اور ان کے ظلم سے آزاد کروایا گیا۔ علاؤالدین نے جو زراعتی اور معاشی اصلاحات کیں اس کے نتیجہ میں تجارتی راستے محفوظ ہو گئے جس کی وجہ سے شہر اور گاؤں کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا اور لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر روک ٹوک کے آنے لگے۔ اس کی ایک معاشی اصلاح یہ تھی کہ اس نے تجارت میں درمیانی ایجنٹوں کے طبقہ کا خاتمہ کر دیا کہ جو سارا منافع خود ہضم کر جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے تجارت کو فروغ ہوا اور نچلے طبقوں کی

بنیادی ضروریات آسانی سے پوری ہونے لگیں۔

علاؤالدین نے ہندوستان میں سیکولر پالیسی کو اختیار کیا' اور اپنی اصلاحات کے ذریعہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام کئے۔ اس لئے ہندوستان کی تاریخ میں علاؤالدین کا عہد خوش حالی' امن و امان' اور عوامی سکون کا زمانہ ہے جب کہ اس کے مقابلہ میں جن سلاطین نے مذہبی پالیسی کو اختیار کیا' جن میں التمش' اور فیروز شاہ قابل ذکر ہیں وہ حکمران ناکام رہے۔

پروفیسر حبیب نے ایک مختصر سی کتاب محمود غزنوی پر بھی لکھی' کیونکہ مذہبی تعصبات کی جنگ میں مسلمان اسے بطور ہیرو پیش کر رہے تھے' اور جب اسے مسلمانوں کا ہیرو بنایا گیا تو اس میں مذہبی صفات کو بھی پیدا کیا گیا اور اس کی شخصیت اور حکومت کا تجزیہ اس طرح سے کیا گیا کہ وہ اسلام کا حامی اور مبلغ بن کر ابھرا اور ہندوستان میں اس کی فتوحات کو جہاد کہا گیا۔ دوسری طرف ہندو نقطہ نظر تھا جو انہیں دلائل کو لے کر اس بات کو ثابت کر رہے تھے کہ مسلمانوں نے مذہبی بنیادوں پر ان کے ساتھ کیا کیا مظالم کئے۔ اگر مسلمان مندروں کی تباہی کو اسلام کی عظمت کہتے تھے تو ہندو اس تباہی کو ہندو دشمنی اور ظلم سے تعبیر کرتے تھے۔ تاریخ کے اس نقطہ سے تاریخ کا صحیح تجزیہ نہیں ہو رہا تھا اور یہ تاریخ لوگوں میں نفرت اور تعصب کو پیدا کر رہی تھی۔

پروفیسر حبیب نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ محمود غزنوی کی شخصیت اس کے کردار اور اس کی فتوحات کا تجزیہ تاریخی حیثیت سے کیا جائے کہ جس میں مذہبی جذبات اور خیالات کا دخل نہ ہو۔

پروفیسر حبیب نے محمود غزنوی کے عہد کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ گیارہویں صدی میں اسلام جمہوری طاقت نہیں رہا تھا بلکہ یہ حکمران طبقوں کے مفادات کا تحفظ کر رہا تھا۔ اس میں محض رسومات اور روایات رہ گئیں تھیں کہ جن کے ذریعہ انفرادی نجات تو مل سکتی تھی مگر اجتماعی طور پر اس کی توانائی ختم ہو گئی تھی۔

محمود قدیم ایرانی طرز کا حکمران تھا کہ جو طاقت کے استعمال میں کسی اخلاقی اقدار کا قائل نہیں تھا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے کامیاب ہوا' اپنے کردار کی وجہ سے نہیں۔ ہندوستانی مہمات کے ذریعہ وہ اپنے لئے وسط ایشیا میں سلطنت تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہندوستان پر اس لئے مستقل طور پر قبضہ نہیں کیا کہ بغیر مسلمان آبادی کے ایسا قبضہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے ہندوستان میں مذہب کی نہ تو تبلیغ کی اور نہ لوگوں کا مذہب بدلوایا۔ وہ ہندوستان میں اس لئے زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرا کہ اس صورت میں فوج اور مقامی آبادی میں تصادم کا خطرہ تھا' اس لئے

فتح کے بعد وہ جمع شدہ دولت اٹھاتا اور واپس چلا جاتا تھا۔ اس طرح سے اس نے ہندوستان کی صدیوں سے جمع شدہ پونجی کو ہتھیا لیا۔

ہندوستانی قومیت کے نقطہ نظر سے محمود غزنوی غیر ملکی تھا اس لئے اس کا ہندوستان کی عوامی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ جو حکمرانوں کی تاریخ تھی اور جس میں مذہبی تعصبات اور تنگ نظری تھی، اس تاریخ میں ہندوستانی متحدہ قومیت کی بنیادیں نہیں ملتی تھیں، اس لئے پروفیسر حبیب نے ہندوستان کی تاریخ میں صوفیاء کے کردار کو ابھارا، کیونکہ ان کی تعلیمات میں انہیں محبت، رواداری، اور آشتی کا پیغام ملا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صوفیا کی تعلیمات کی بنیاد پر ہندوستان سے فرقہ وارانہ جذبات کو ختم کرکے یہاں قومی ہم آہنگی کو پیدا کیا جا سکتا ہے اس لئے جہاں وہ حکمرانوں میں علاؤالدین کی شخصیت سے متاثر تھے وہاں وہ صوفیوں میں معین الدین چشتیؒ کی تعلیمات کو ہندوستانی معاشرے کے لئے انتہائی اہم سمجھتے تھے۔

احیا کی تحریک

کسی بھی معاشرے میں احیاء کی تحریک اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ سیاسی و معاشی اور سماجی طور پر زوال پذیر ہوتا ہے زوال کے اس دور میں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا ایک حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ مذہب کا احیاء کیا جائے اور اسے خالص شکل میں نافذ کیا جائے کیونکہ ان کے نزدیک معاشرے کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور مذہب سے دوری لوگوں میں نفاق' عداوت' اور بدعنوانیوں کو پیدا کرتی ہے۔ اس طرح سے احیاء کی تحریک کے حامی اس بات پر متفق ہوتے ہیں کہ مذہب معاشرہ میں فعال کردار ادا کرنے میں ناکام ہوگیا۔ اس کی توانائی و قوت ختم ہو گئی' اور وہ معاشرے کے اتحاد کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ مگر وہ معاشرے کی خرابیوں کی ذمہ داری مذہب پر ڈالنے کے بجائے خود معاشرے پر ڈالتے ہیں کہ انہوں نے مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا اور غیر مذہبی رسوم و رواج کو اختیار کرکے اس کی روح کو بگاڑ دیا۔ ان کے نزدیک مذہب معہ اپنے عقائد اور تعلیمات کے اپنی جگہ برقرار رہتا ہے' اب یہ معاشرہ کا کام ہے کہ اسے اختیار کرے یا نہ کرے۔ اگر وہ اسے اختیار کرتا ہے تو اس صورت میں اس کی بھلائی ہے اور اگر انکار کرتا ہے یا اس میں ترمیم و تنسیخ کرتا ہے تو اس صورت میں وہ برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس لئے احیاء کی تحریک کے حامی اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر مذہب کو اس کی اصل شکل میں واپس لایا جائے اور اس میں جو غیر مذہبی روایات شامل ہو گئی ہیں انہیں دور کر دیا جائے تو اس صورت میں معاشرے کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور معاشرہ کے زوال کو روکا جاسکے گا۔

احیاء کی تحریک سب سے پہلے اس بات پر زور دیتی ہے کہ مذہب میں جو نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے ہیں ان کو ختم کرکے تمام لوگوں کو متحد کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ مذہب کو اس کی ابتدائی شکل میں واپس لایا جائے کیونکہ اس کے ابتدائی زمانہ میں اس کے تمام ماننے والوں میں اتفاق و اتحاد تھا اور نئے نئے فرقے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس بنیاد پر احیاء کی تحریک مذہب میں داخل ہونے والی ہر نئی چیز کی مخالفت کرتی ہے اور بدعتوں کے خلاف جہاد کرتی ہے تاکہ ان کو

مٹا کر مذہب کی خالصیت کو بحال کیا جائے۔

بدعتوں اور غیر مذہبی روایات و رسومات کو ختم کرنے کے سلسلہ میں تحریک کے پیروکاروں میں زبردست جوش و ولولہ ہوتا ہے اور وہ شدت اور تعصب کے ساتھ ان کے خلاف مہم چلاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کی روا داری یا نرمی کو اختیار نہیں کرتے اور جو بھی ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے اسے اپنا مخالف اور دشمن تصور کر کے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تحریک کے حامی سیاسی قوت و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں تو پھر وہ ریاستی اداروں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ان کی مدد سے اپنے نظریات کو فروغ دیتے ہیں۔ جیسے سعودی عرب میں ہوا' وہاں عبدالوہاب کے پیروکار اور سعودی خاندان میں جو معاہدہ ہوا اس کے بعد سے سعودی ریاست کے اداروں نے وہابی عقائد کو سختی و شدت کے ساتھ وہاں نافذ کیا اور اپنے تمام مخالفین کا خاتمہ کر دیا۔ اگر ان کے پاس سیاسی قوت نہیں ہوتی ہے تو پھر یہ اخلاقی قوت کو استعمال کرتے ہوئے شدت کے ساتھ اپنے نظریات کا پرچار کرتے ہیں' جیسے کہ مہدویہ تحریک کے حامیوں نے کیا' اور ان تمام لوگوں کو جو ان کے عقائد کو نہیں مانتے یہ انہیں کافر گردانتے تھے۔ گجرات میں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو شخص ان کی بات ماننے سے انکار کرتا تھا اسے قتل کر دیا جاتا تھا' اور ان کا ہر پیروکار اپنے عقائد کی خاطر جان دینے پر تیار رہتا تھا۔ ان کی اس شدت کا نتیجہ ہوا کہ علماء' حکومت' اور لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ اس صورت میں لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تحریک کی وسعت سکڑ جاتی ہے اور وہ ایک محدود دائرے میں قید ہو جاتی ہے اور اسی میں وہ اپنے نظریات کو برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ مہدویہ تحریک کے پیروکار "دائروں" میں محدود ہو گئے' جہاں وہ دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں اپنی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔

اس شدت کو ہندوستان میں سید احمد شہید اور ان کے پیروکاروں نے اختیار کیا۔ یہ بھی احیائے دین کے لئے تمام غیر اسلامی رسومات کو مٹانے کے درپے تھے' اور لوگوں کو ذہنی طور پر اس بات پر آمادہ کرنے کے بجائے قوت سے خالص اسلام کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولوی اسماعیل شہید جو کہ اس تحریک کے ایک ممتاز رکن تھے ان سے کہا گیا کہ کیا احکام الٰہی کے لئے کتب خانہ رکھنا ضروری ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم احکام الٰہی رسولؐ اور صحابہؓ کے طریقے پر پہنچاتے ہیں اور اگر کوئی نہیں مانتا تو تلوار سے بتاتے ہیں۔ اس شدت کی وجہ سے ان کی دوسرے فرقوں کی جانب سے سخت مخالفت ہوئی اور چونکہ انہوں نے اسی شدت کی پالیسی کو صوبہ سرحد میں اختیار کیا اس لئے عوام ان کے خلاف ہو گئے۔

احیاء کی تحریک کی بنیاد معاشرے کی احساس محرومی پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب مسائل کا انبار بڑھ جاتا ہے تو اس وقت ان کے حل کے لئے معاشرہ کے سامنے کئی راستے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ذریعہ اصلاح کا ہوتا ہے۔ یہ راستہ وہ طبقے اختیار کرتے ہیں جو کہ اس نظام میں مراعات یافتہ ہوتے ہیں اور وہ نظام کو تبدیل کئے بغیر اصلاح کے ذریعہ اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرا راستہ مذہبی احیاء کا ہوتا ہے جس کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ خرابیوں کی اصل وجہ مذہب میں بگاڑ ہے' اس لئے اگر اس کو ختم کر دیا جائے تو معاشرہ کے تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ احیاء کی تحریکیں معاشرے میں اسی وقت مقبول ہوتی ہیں کہ جب معاشرہ سیاسی طور پر عدم استحکام کا شکار ہو اور معاشی بد حالی سے ہر شخص متاثر ہو۔ اگر معاشرہ میں سیاسی و معاشی استحکام ہے تو اس صورت میں احیاء کے نظریات لوگوں کو متاثر نہیں کرتے۔ مثلاً اکبر کے بعد عہد جہاں گیری میں شیخ احمد سرہندی نے اسلام کے احیاء کی بات کی اور جو ہندو رسومات مسلمانوں نے اختیار کر لیں تھیں ان کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا اور اسلام کی حالت زار اور بدعتوں کے خلاف سخت احتجاج کیا مگر یہ تحریک اس لئے مقبول نہیں ہوئی کہ اس وقت مغل معاشرہ سیاسی و معاشی طور پر مستحکم تھا' مسلمانوں میں تحفظ کا احساس تھا اور وہ کسی بھی طرح احساس محرومی کا شکار نہیں تھے' اس لئے ان کی تحریک انتہائی کمزور رہی اور ان کے خیالات سے بہت کم لوگ متاثر ہوئے۔ لیکن جب آخری عہد مغلیہ میں مسلمان معاشرہ زوال پذیر ہوا اور سیاسی و معاشی محرومیاں بڑھ گئیں تو اس وقت عوام کے ایک طبقہ نے جوش و خروش کے ساتھ سید احمد شہید کا ساتھ دیا اور ان کے ہاتھ پر ایک بڑی تعداد نے بیعت کی۔

اس لئے احیاء کی تحریک میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے راہنما کون تھے؟ ان کا تعلق کس طبقہ سے تھا؟ اور وہ طبقہ کس حد تک مراعات سے محروم تھا؟ مثلاً سید احمد شہید کا تعلق علماء کے اس طبقہ سے تھا جو مغل زوال سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا' وہ اپنے احساس محرومی کو احیاء کی تحریک کے ذریعہ ایک مقصدیت دینا چاہتے تھے۔ ان کی تحریک ان علاقوں میں زیادہ مقبول ہوئی جو مغل سلطنت کی کمزوری سے متاثر ہوئے تھے اور جہاں انگریزی اقتدار قائم ہو گیا تھا' خصوصیت سے شمالی ہندوستان' بنگال اور بہار۔ مگر وہ علاقے جو مغل مرکز سے دور تھے وہ اس احساس محرومی کا شکار نہ تھے جیسے سندھ' پنجاب اور سرحد' اس لئے ان علاقوں میں سید احمد شہید کی تحریک نے لوگوں کو متاثر نہیں کیا۔

احیاء کی تحریک میں شمولیت کے بعد اس کے پیروکاروں کی ذہنیت ایک خاص ماحول میں تشکیل ہوتی ہے۔ چونکہ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ خالص مذہب کو ماننے والے ہیں اس لئے دوسرے فرقوں سے تعلق رکھنے والے ان کے نزدیک گمراہ ہوتے ہیں' ان کا یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ سچائی اور حقیقت ان کے پاس ہے اور خدا کی رحمتیں صرف ان کے لئے ہیں اس احساس کی وجہ سے وہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں اور دوسرے وہ تمام لوگ جو ان کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے ان کو وہ کم تر سمجھ کر خود کو ان سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح سے ان کی تحریک صرف ان لوگوں میں محدود ہو جاتی ہے۔ کہ جو ذہنی طور پر ہم آہنگ ہوں۔ یہ تحریک کو ایک برادری کی شکل دے دیتی ہے' اس کے اراکین میں بھائی چارہ اور اخوت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ خود کو علیحدہ سمجھتے ہیں اس لئے انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیا تو وہ ختم کر دیے جائیں گے' یہ احساس انہیں برابر آپس میں ملاتا اور متحد کرتا رہتا ہے اور ان میں سماجی طور پر تحفظ پیدا کرتا ہے۔

اکثر احیاء کی تحریکیں معاشرہ کی اکثریت کی مخالفت کا شکار ہو جاتی ہیں اور سیاسی طور پر حکومتیں بھی ان کے خلاف ہو جاتی ہیں' کیونکہ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں کہیں طاقت ور ہو کر ان کے خلاف نہ ہو جائیں۔ اور یہ اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ ہر احیاء کی تحریک کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیاسی قوت کو حاصل کر کے اپنی تعلیمات کو شدت اور جبر کے ساتھ نافذ کریں۔ اس لئے ابتداء میں وہ تبلیغ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیروکاروں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں' اور پھر ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ حکمران' اور حکمران طبقوں کو ذہنی طور پر اپنے ساتھ ملایا جائے اور اس کی مدد سے ریاستی اداروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس لئے ہر حکومت اس سے ڈرتی ہے کہ ان کی طاقت بڑھنے نہ پائے۔ مہدوی تحریک کے ساتھ یہی ہوا کہ سوری خاندان کو انکی طاقت سے ڈرایا گیا اور اسی وجہ سے انہوں نے اس تحریک کے خلاف سخت اقدامات کئے۔

حکومتوں' علماء' اور عوام کی یہ مخالفت ان میں مظلومیت کے احساس کو پیدا کرتی ہے' اور اس احساس کے دباؤ کے تحت اس کے پیروکاروں میں اتحاد بڑھتا رہتا ہے اور اکثر اسی مخالفت کی وجہ سے یہ زیر زمیں چلی جاتی ہیں' اور پھر ان کے طور طریقے اور برتاؤ میں پر اسراریت آجاتی ہے۔ وہ اپنی تحریک کے علاوہ کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے' اپنی عبادت کیلئے خفیہ جگہیں بناتے ہیں' کسی غیر کو اپنی مجلسوں میں آنے نہیں دیتے اور اپنی تعلیمات کے لئے علامتوں کا استعمال کرنے لگتے ہیں کہ دوسرا نہ سمجھ پائے۔ ان کی یہ علیحدگی ان کے بارے میں

طرح طرح کی افواہوں کو جنم دیتی ہے' اِس طرح سے یہ معاشرہ سے کٹ کر ایک علیحدہ فرقہ بن جاتے ہیں۔

بنیادی طور پر احیاء کی تحریک اس تصور کی بنیاد پر شروع ہوتی ہے کہ ہزار سال بعد کوئی مجدد آئے گا اور اس عرصہ میں دین میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں انہیں دور کر کے تجدید دین کرے گا۔ اس لئے مسلمانوں میں مجدد اور مہدی کا تصور موجود ہے' اور یہ مجدد اور مہدی اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب مسلمانوں کا معاشرہ مسائل میں جکڑ جاتا ہے۔

خصوصیت سے جب یورپی اقوام نے مسلمان ملکوں کو اپنی نوآبادی بنایا تو اس کے نتیجہ میں ان کی سیاسی طاقت کا خاتمہ ہوا' اور نوآبادیات کے قائم ہونے کے بعد مسلمان معاشرے جن مسائل سے گزرے ان کے ردعمل کے طور پر جو طریقے اختیار کئے گئے وہ یہ تھے۔ اول یہ کہ مغرب سے مقابلہ کرنے کے لئے مغربی تہذیب کو اختیار کیا جائے' دوسرا یہ کہ اسلام کو موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے' اور تیسرا یہ کہ مذہب کا احیاء کیا جائے اور جدید دور کی ہر روایت کو ختم کر دیا جائے۔

چنانچہ کچھ ملکوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مغربی تہذیب کو جوں کا توں اختیار کر لیا جائے' اس کی مثال ترکی سے دی جا سکتی ہے۔ مصطفےٰ کمال اتا ترک نے سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد ترکی کو مغربی بنانے کی پوری پوری کوشش کی اور ظاہری طور پر اس نے ترکی کو ایسا بنا بھی دیا۔ مگر محض لباس اور چند عادات کے اختیار کرنے سے کسی دوسری تہذیب کی روح معاشرہ میں سرایت نہیں کرتی۔ جب تک کہ مغرب کے تفکر' سوچ' اور عقلیت کو اختیار نہیں کیا جائے گا اس وقت تک مغربی تہذیب کے اثرات سے فیض یاب نہیں ہوا جائے گا۔ ترکی نے مغرب کی ظاہری باتوں کو تو اختیار کیا مگر اس کے فلسفہ کو نہیں۔ اور یہ تجربہ وہاں ناکام رہا۔

دوسری صورت میں اسلام کو جدید تقاضوں کے تحت تشکیل دینے کا کام ہوا' اور اس صورت میں کبھی اس کا رشتہ سرمایہ دارانہ نظام سے جوڑا گیا اور کبھی اسے اشتراکیت کا لبادہ اوڑھایا گیا' مگر یہ دونوں کوششیں بھی ناکام ہوئیں اور مسلمان ملکوں میں ان کے ذریعہ سے بھی کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس عمل نے ان میں زبردست احساس کمتری کو پیدا کر دیا۔ اس احساس کمتری اور محرومی نے اسلامی ملکوں میں احیاء کی تحریکوں کو فروغ دیا تاکہ اس کے ذریعہ خالص اسلامی تعلیمات کا نفاذ کیا جائے اور اسلام کو ایک علیحدہ قوت کی حیثیت سے تسلیم کرایا جائے۔

ایک اہم سوال اس مرحلہ پر یہ اٹھتا ہے کہ کیا یہ احیاء کی تحریکیں ماضی کو واپس لا سکتی ہیں

اور کیا تاریخ میں ایسا کوئی دور آیا ہے کہ جس نے تاریخی عمل کو آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی جانب لوٹا دیا ہو۔ اور پرانی اقدار کو دوبارہ سے نافذ کر دیا ہو' اس کا جواب نفی میں ہے۔ انسانی تاریخ میں احیاء کا تصور ناممکن ہے۔ فطرت میں یہ احیاء قرار ہوتا ہے کہ موسم آتے اور جاتے رہتے ہیں' سردی و گرمی' بہار و خزاں کے موسم ایک چکر میں گردش کرتے ہیں' مگر انسانی تاریخ میں جو لمحہ گزر جاتا ہے وہ ماضی بن جاتا ہے اور دوبارہ سے اسے واپس نہیں لایا جا سکتا ہے انسانی ذہن جو برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے' وہ اپنے ماحول کے تقاضوں اور روایات کو بدل دیتا ہے' اس لئے ہر نسل اپنی روایات کو خود حالات کے مطابق تشکیل کرتی ہے۔

احیاء کے سلسلہ میں زبان کی مثال دی جا سکتی ہے کہ زبان وقت کے ساتھ بدلتی ہے یہاں تک کہ ہر نسل کی زبان مختلف ہوتی چلی جاتی ہے۔ پرانے الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں' نئے الفاظ ضرورت کے تحت زبان میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں' غیر ضروری الفاظ متروک قرار دیدیے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی مرحلہ پر یہ کوشش کی جائے کہ قدیم زبان کو زندہ کیا جائے تو یہ ممکن نہیں ہوتا' کیونکہ تاریخ کو مٹا کر ماضی کو واپس نہیں لایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سے کسی قدیم تہذیب کا احیاء ممکن نہیں' یہ سب ماضی کا حصہ ہیں۔

اس لئے معاشرے کے مسائل کا حل اس میں ہے کہ خود کو نئے تقاضوں اور حالات کے تحت ڈھالا جائے' اور جو روایات و افکار اس ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوں انہیں ترک کر دیا جائے۔ جب تک ذہن نہیں بدلیں گے' نظام نہیں بدلے گا' اس وقت تک ہم تاریخ کے عمل کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔

نو آبادیاتی دور: ایک تجزیہ

برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں انگریزی دور حکومت انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے' اور اس حکومت کے بارے میں وقت کے ساتھ ساتھ اہل ہندوستان کا نقطۂ نظر بھی بدلتا رہا ہے۔ جب انگریزی حکومت اپنے عروج پر تھی تو اس وقت اہل ہندوستان میں وفاداری کے جذبات کو ابھارنے اور برقرار رکھنے کی خاطر "انگریزی حکومت کی برکتوں" کے عنوان سے نصاب کی کتابوں میں طالب علموں کو اس کے فوائد گنوائے جاتے تھے اور یہ ثابت کیا جاتا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان میں نہیں آتے تو اس ملک میں رہنے والی مختلف قومیں' قبائل' برادریاں اور ذات پات کے لوگ آپس میں قتل و غارت گری کر کے ایک دوسرے کو ختم کر دیتے۔ انگریزوں نے نہ صرف اس ملک میں امن و امان کو بحال کیا۔ بلکہ اس کی صنعتی و زراعتی ترقی کو فروغ دے کر اسے خوش حال بنایا' یہاں پر قانون کی بالادستی قائم کی' عدل و انصاف کو رائج کیا' انسانی حقوق کی پاسداری کی' آزادی رائے کا احترام کیا' اور ہندوستان کو جدید دنیا کے تقاضوں کے مطابق ڈھال کر اسے جدید دور میں داخل کیا۔

جب ہندوستان میں جدید یورپی تعلیم یافتہ طبقہ ابھرا' اور اس نے جدید یورپی نظریات و افکار کے زیر اثر قوم پرستی کی تحریک چلائی' تو انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جو دلائل دیئے ان میں سب سے زیادہ اہمیت معاشی لوٹ کھسوٹ کو دی گئی کہ کس طرح سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ابتداء میں ہندوستان میں ناجائز طریقوں سے دولت اکٹھی کی اور کس طرح سے بعد میں صنعتی برطانیہ نے ہندوستان کے پیداواری وسائل کا استحصال کیا اور یہاں سے دولت لے جا کر ہندوستانیوں کو غریب و مفلس بنا دیا۔ اس کا اثر ہندوستان کی اپنی صنعتی ترقی پر پڑا۔ اس کی روایتی صنعتیں تباہ ہو گئیں' دست کار و ہنرمند معمولی مزدور بن گئے' اور ہندوستان ایک پس ماندہ ملک بن کر رہ گیا۔ نو آبادیاتی حکومت نے صرف معاشی لوٹ کھسوٹ ہی نہیں کی بلکہ ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر پس ماندہ بنانے کی غرض سے ان کے روایتی ثقافتی ورثہ کو تباہ کیا' ان کی تاریخ کو مسخ کیا اور ان پر مغربی تہذیب کو مسلط کیا۔ ان دلائل کی بنیاد پر ان کے یہ مطالبات تھے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا' اس کے وسائل پر ان کا کنٹرول نہیں

ہو گا' ان کی حکومت و اقتدار نہیں ہو گا' اس وقت تک ہندوستان کی نہ تو شناخت ابھرے گی اور نہ ہی وہ پس ماندگی سے نکل پائے گا۔ ان کے دلائل کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جب انگریزی حکومت کی لوٹ کھسوٹ ختم ہوگی تو اس ملک کے وسائل سے عوام کی غربت کو دور کیا جائے گا' اور جدید دنیا کے تقاضوں کے تحت ملک ترقی کر کے عوام کو بہتر اور معیاری زندگی دے گا اس لئے ان نعروں اور دلائل نے عوام میں آزادی کے بارے میں بڑے سہانے خوابوں کو پیدا کیا' اور انہوں نے اپنے راہنماؤں کا ساتھ دیا تاکہ ان خوابوں کی تعبیر ہو سکے۔

آزادی کے بعد برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کی دو علیحدہ ریاستیں قائم ہوئیں' اور ابتداء ہی سے ان دونوں ملکوں کی سیاست دو مختلف راستوں پر چلی۔ پاکستان میں اس مختصر میں عرصہ میں جو سیاسی معاشی اور سماجی تبدیلیاں آئی ہیں انہوں نے ایک بار پھر اس بات پر مجبور کیا کہ ہندوستان میں برطانوی عہد کا تجزیہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس عہد کے روشن پہلو کون کون سے تھے۔ کیونکہ ہوا یہ کہ نو آبادیاتی نظام کی تباہ کاریوں اور استحصال پر تو بہت لکھا گیا' اور آزادی کی جدوجہد میں لوگوں کے جذبات کو ابھارنے اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے اس کی ضرورت بھی تھی' مگر بعد میں اس کا یہ سیاسی استعمال جاری رہا۔ آزادی کے بعد بھی جو خرابیاں اور بدعنوانیاں ہمارے حکمرانوں نے کیں' اس خرابی کو نو آبادیاتی دور کے اداروں اور روایات کے سر منڈھ دیا گیا اور کہا گیا کہ جب تک یہ ادارے نہیں بدلیں گے اس وقت تک یہ خرابیاں رہیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تنقید کی وجہ سے ہمارے حکمراں طبقوں کی نااہلی اور بدعنوانی چھپ گئی' اور کسی نے اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا کہ ان اداروں اور روایات کو بگاڑنے میں ہمارے حکمرانوں کا کتنا ہاتھ ہے' اور ملک میں اصل بحران کے ذمہ دار یہ لوگ ہیں۔

یہ ضرور ہوا کہ آزادی کے بعد نو آبادیاتی نظام کے ڈھانچہ کو اسی طرح سے برقرار رکھا گیا کیونکہ جن لوگوں نے انگریزوں کے بعد اقتدار سنبھالا تھا وہ ان اداروں کو استعمال کر کے اپنی طاقت و اثر و رسوخ کو عوام پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں ان اداروں کے نظم و نسق میں تبدیلیاں ہونا شروع ہو گئیں اور حکمراں طبقوں نے انہیں اپنی مرضی اور اپنے مفادات کے تحت تبدیل کرنا شروع کر دیا' مثلاً برطانوی دور میں بیوروکریسی کا مقصد حکومت کے وقار کو قائم رکھنا تھا' اس کے اعلیٰ افسران کردار کے لحاظ سے انتہائی ایماندار' دیانت دار' محنتی اور فرض شناس ہوتے تھے۔ دفتری قوانین و ضوابط کی پوری پابندی کی جاتی تھی۔ قانون کی نظر میں سب برابر تھے' مقدموں کے فیصلے پیسہ یا سفارش پر نہیں ہوتے تھے' لیکن جلد ہی یہ

روایات بدلنا شروع ہو گئیں' افسران اعلیٰ میں رشوت و بدعنوانیاں آہستہ آہستہ بڑھتی گئیں' اعلیٰ عہدوں پر قابلیت و صلاحیت کے بجائے سفارشوں پر تقرر ہونے لگے' عدالتوں میں انصاف کے بجائے بے انصافی کا رواج ہو گیا' جس کی وجہ سے جرائم کی تعداد بڑھ گئی' ٹیکس کی چوری سے بچا ہوا کالا دھن قانونی طور پر جائز ہو گیا' اس لئے ان اداروں کا خاکہ تو وہی ہے جو برطانوی دور حکومت میں بنایا گیا تھا مگر اب ان میں رنگ مقامی بھر دیئے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک میں لوٹ کھسوٹ' بدامنی' لاقانونیت اور عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ ہمارے ہاں اب تک نو آبادیاتی نظام اور اس کے ادارے باقی ہیں' ان اداروں کو ہمارے مقامی حکمران تبدیل کر چکے ہیں' اور ان کا مقصد اب ملک و قوم کے بجائے ان حکمرانوں کے مفادات کا تحفظ رہ گیا ہے۔

1

انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان میں مغربی تہذیب بھی آئی۔ ابتدائی دور میں جب تک انگریزی اقتدار مضبوط نہیں تھا' انہوں نے مغلوں کے نظام حکومت کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ برقرار رکھا' مگر جیسے جیسے ان کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا' اسی طرح سے مقامی ادارے اور روایات ان کی راہ میں حائل ہونے لگے' اور انہیں اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان رکاوٹوں کو ختم کیا جائے اور ان کی جگہ نو آبادیاتی نظام کے تقاضوں کے تحت مغربی اداروں اور روایات کو رواج دیا جائے۔

کیونکہ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندو اور مسلمان معاشرے اپنی روایات' اقدار' و رسومات پر سمجھوتہ کر چکے تھے' اور اب یہ ایک دوسرے کے لئے خطرہ کا باعث نہیں رہے تھے اس لئے انہوں نے اپنے اپنے معاشرتی ڈھانچوں کو ایک حالت میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ ذات پات کی تقسیم' غیر مساوی اور طبقاتی نظام' معاشی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم' اور مذہبی عقائد و روایات میں پختگی دونوں معاشروں کی خصوصیات تھیں۔ انہیں نہ تو کسی قسم کے اندرونی چیلنجوں کا سامنا تھا اور نہ ہی بیرونی خطرات سے واسطہ' اس لئے دونوں معاشرے اپنی اپنی حالتوں پر مطمئن تھے۔

اس لئے جب انگریزی اقتدار قائم ہوا' اور مغربی تہذیب کے نظریات و افکار یہاں پر آئے تو انہوں نے پہلی مرتبہ ایک بے حس اور پر جمود معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نئے نظریات و خیالات سب سے پہلے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت' مذہب' اور تاریخ پر اثر انداز

ہوئے۔ اور ان کے مذہبی عقائد اور مذہبی رسومات کو چیلنج کیا۔ اس کا فوری نتیجہ تو یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے معاشرے پس ماندہ اور جہالت کا شکار ہیں' اور ان کی روایات و اقدار بے روح اور بے طاقت ہیں' اور اگر یہی صورت حال باقی رہی تو وہ جدید چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے' ان کی تہذیب و شناخت اور مذہبی عقائد سب ختم ہو جائیں گے۔ اس کے رد عمل میں سب سے پہلے ہندوؤں میں مذہبی اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں تاکہ جن مذہبی روایات نے معاشرہ کو پس ماندہ بنا رکھا ہے انہیں تبدیل کیا جائے' مثلاً عورت کا ستی ہونا' بیوہ کا شادی نہ کرنا' اور عورت کو سماجی طور پر انتہائی نیچا رکھنا' راجہ رام موھن رائے کی برہمو سماج' ان اصلاحی تحریکوں کی ابتدا تھی۔

اسی طرح جب اسلام پر تنقید شروع ہوئی تو اس کے دفاع کے لئے اور اسلام کو جدید اور سائنسی مذہب کے طور پر پیش کرنے کا کام سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے کیا۔ اس طرح ہندوستان کے معاشرہ میں پہلی مرتبہ ذہنی اور دانش ورانہ بحث کی ابتداء ہوئی اور یہ بحث و مباحثہ اب جذبات کے سہارے نہیں تھا' بلکہ اپنے موقف کی حمایت کے لئے دلیل' تحقیق' اور سنجیدگی کی ضرورت تھی۔ ان بحثوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے مذاہب کے خلاف وہ تنقید بھی سنی کہ جسے وہ اس سے پہلے شاید برداشت نہیں کرتے۔ مگر ان بحثوں نے نہ صرف ان میں قوت برداشت' رواداری کا جذبہ پیدا کیا بلکہ ان کے تعصبات کو بھی کم کیا اور انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ کوئی بھی چیز تنقید سے بالاتر نہیں اور آفاقی و دائمی قدریں بھی اس کی زد میں آجاتی ہیں۔ اس لئے جدید ذہن و عقل کی بنیاد پر کسی چیز کو تسلیم کرنا ہے۔ جذبات کے ذریعہ اپنے موقف کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان بحثوں کے ذریعہ صرف یہ شعور ہی پیدا نہیں ہوا' بلکہ جب اپنے اپنے مذاہب کا دفاع کیا گیا تو اس کے لئے مذاہب کا مطالعہ بھی کیا گیا' اور اس کے ساتھ ہی تاریخ و ثقافت کو بھی کھنگالا گیا' اس طرح ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ پہلی مرتبہ دوسرے مذاہب' ان کی تعلیمات' اور ان کے تاریخی کردار سے واقف ہوا۔ اس نے اس کے علم کی سرحدوں کو وسیع کر دیا اور لوگوں میں تحقیق کا جذبہ و شوق پیدا ہوا' اور یہی وہ جذبہ تھا کہ جس نے معاشرے کی راہنمائی عقلیت کی طرف کی۔

اور یہی وہ تحقیق کا عنصر تھا کہ جس نے اہل ہندوستان کے لئے ہندوستان کو دریافت کیا۔ وہ ہندوستان کہ جو قدیم عہد کے تہذیبی آثار کو زمین میں دبائے' نامعلوم و انجان تھا' اور یہ وہ ہندوستان تھا کہ جس کی تاریخ' ثقافت' اور مذہب قلمی مسودات میں محفوظ عالموں کی پہنچ سے دور تھا۔ لوگ وقت کے ساتھ ماضی کو فراموش کر چکے تھے' حقائق کے بجائے صرف قصے کہانیاں

اور داستانیں باقی رہ گئی تھیں۔ ناواقفیت و جہالت اس درجہ پر پہنچ چکی تھی کہ خود ان کے اجداد کی بنائی ہوئی عمارتیں ان کے لئے ایسی ہو گئی تھیں کہ وہ شاید کسی جناتی مخلوق سے بنائی ہوں۔ قدیم آرٹ و فن کے نوادرات ان کے لئے پیچیدہ ہو گئے تھے۔ علم و ادب اور فن چند خاندانوں میں سمٹ کر ندرت و خوبی اور تخلیق کھو چکے تھے' اس لئے اہل یورپ کے لئے ہندوستان ایک ایسا ملک تھا کہ جس کی کوئی تاریخ نہ تھی' جس کے مذہبی عقائد تعصبات و جہالت کا مجموعہ تھے' جس کا علم و ادب فرسودہ اور بیکار تھا' جس کے عوام جاہل' کاہل' اور پس ماندہ تھے۔ ہندوستانی ایک ایسی مخلوق تھی کہ جسے اپنے ہی ملک کی عظمت سے واقفیت نہ تھی' جو اپنے ملک میں اجنبی تھے۔

ایسے میں رایل ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال نے قدیم مسودوں کی اشاعت کا کام شروع کیا' جس نے پہلی مرتبہ ہندو مذہب اور اس کی تعلیمات و فلسفہ کو دنیا سے روشناس کرایا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے دور کی تاریخ پر معاصر فارسی کتابیں شائع کرائیں' جن کی وجہ سے جدید ہندوستانی تاریخ کی تشکیل کا کام آسان ہو گیا۔ محکمہ آثار قدیمہ کے قیام کے بعد سے قدیم عہد کے آثاروں کی کھدائی اور دریافت نے ہندوستانی تہذیب کی شان و شوکت کی عظمت کو اجاگر کیا۔ موہنجوداڑو کی دریافت نے ہندوستانی تہذیب کو دنیا کی بڑی تہذیبوں میں شامل کر دیا۔ جدید تاریخ نویسی میں سب سے پہلے یورپی مورخوں نے ہندوستان کی بکھری ہوئی تاریخ کو جمع کر کے مرتب کیا' اور جیسے جیسے تاریخ کی تشکیل ہوتی گئی' اسی طرح سے ہندوستان میں قومیت کے جذبات بڑھتے گئے۔ ہندوستان کی وہ قومیں' قبائل' اور برادریاں جو ماضی سے کٹی ہوئی' تاریخ سے بے بہرہ تھیں' ان کی تاریخ کو تشکیل دیا گیا' جیسے راجپوتوں کی تاریخ ٹاڈ نے لکھی' مراہٹوں کی تاریخ ڈف نے' سندھ کے باشندوں کے حالات برٹن نے' اور اسی طرح بلوچوں اور پٹھانوں کی مستند تاریخ انگریزوں ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔

ہندوستان کے ہر علاقہ اور اس کے باشندوں کی شناخت میں سب سے زیادہ مدد گزیٹرز نے کی' ان میں ہر قسم کی معلومات کو اکٹھا کیا گیا' اور پھر ان معلومات کو پریس کی ایجاد نے ہر اہل علم تک پہنچا دیا۔ اب کتابیں امراء کی ملکیت نہیں رہیں بلکہ یہ عام لوگوں تک پہنچنے لگیں۔ عوامی کتب خانوں کی ابتداء بھی اسی زمانے میں ہوئی' ورنہ یہ کتب خانے اب تک بادشاہوں اور امراء کے ہوتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے اہل علم ان کے محتاج ہوتے تھے۔ اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب رسائل اور اخبارات نے علم کو عام کرنے میں مدد دی اور علم کو چند لوگوں کی اجارہ داری سے نکال کر پھیلا دیا۔

2

انگریزی دور اقتدار میں تعلیم کے مسئلہ پر دو گروہ بن گئے تھے: ان میں سے ایک وہ تھا جو چاہتا تھا کہ مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جائے اور ہندوستان کے مذہبی و سماجی ڈھانچہ کو نہیں بدلا جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم، مغربی علوم کے فروغ، اور سماجی تبدیلیوں کا حامی تھا، کیونکہ اس تبدیلی کے بغیر ہندوستان کی سماجی پس ماندگی کو دور کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگرچہ ابتداء میں مشرقی علوم کے حامی لوگ کامیاب ہوئے اور انہوں نے کالجوں و مدرسوں کے ذریعہ مشرقی علوم و مشرقی زبانوں کی تعلیم پر زور دیا۔ اس کی ایک مثال اردو زبان ہے، کہ جب فارسی زبان کا اثر کم ہوا اور اس کی جگہ اردو نے لی، تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے "ہندوستانی" کا نام دے کر اسے سرکاری زبان کے طور پر اختیار کر لیا اور کوشش کی کہ زبان کو سہل، سادہ اور آسان بنایا جائے تاکہ اس کے دفتری استعمال میں آسانی ہو۔

مشرقی علوم کی یہ سرپرستی جلد ہی ختم ہو گئی، کیونکہ جیسے جیسے انگریزی اقتدار بڑھتا گیا اسی طرح سے ان کی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا۔ حالات نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ یورپی علوم اور طریقہ تعلیم کو ہندوستان میں رائج کریں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مغربی تعلیم کی وجہ سے اہل ہندوستان پر علم و دانش کی ایک ایسی دنیا دریافت ہوئی جو اب تک ان کی نظروں سے اوجھل تھی، اس نے انہیں مغربی افکار و نظریات سے روشناس کرایا، اور انہیں نظریات نے ان میں قوم پرستی، اور آزادی کے جذبات کو پیدا کیا، اور انہوں نے نو آبادیاتی نظام سے انہیں ہتھیاروں سے جنگ لڑی کہ جن ہتھیاروں نے انہیں غلام بنایا تھا۔

3

نو آبادیاتی نظام نے ہندوستان کے سیاسی ڈھانچہ کو بالکل بدل کر رکھ دیا کیونکہ انگریزی حکومت سے پہلے لوگوں کی وفاداری کا مرکز حکمران اور اس کا خاندان ہوا کرتا تھا، ملک اور قوم اور معاشرہ کے تصورات ابھی کمزور اور غیر واضح تھے۔ اس لئے جب بھی حکمران بدل جاتے تھے، لوگوں کی وفاداریاں بھی بدل جاتی تھیں۔ مگر نو آبادیاتی دور میں یہ تبدیلی آئی کہ قوم و ملک کا وسیع نقطۂ نظر پیدا ہوا، اور لوگوں کی وفاداری کا مرکز قوم اور ملک ہو گیا۔ اسی جذبہ نے آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ کی نئی تشکیل میں مدد دی، اور ہندوستانیوں میں اس شوق و جذبہ کو پیدا

کیا کہ وہ ہندوستان' اس کی تہذیب' اور اس کی ثقافت کو نہ صرف دریافت کریں بلکہ اسے محفوظ بھی کریں اور اس کو فروغ بھی دیں۔

اہل برطانیہ اپنے ساتھ جو جمہوری روایات لے کر آئے تھے اور جو نئے ادارے انہوں نے یہاں قائم کئے تھے اس کے نتیجہ میں ہندوستان کا فرسودہ سماجی ڈھانچہ کمزور ہوا۔ مثلاً جب ہسپتال بنے تو اس میں ذات پات کی تمیز کے بغیر تمام مریض ایک ہی ہال میں رہتے تھے' جیل میں قیدیوں کو بھی ساتھ ہی رہنا پڑتا تھا' فوج میں سپاہی بیرکوں میں مل کر رہنے پر مجبور تھے' فیکٹریوں میں تمام مزدور مل کر کام کرتے تھے 'اور عدالت میں سب ہی کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس نے کم از کم شہروں میں ذات پات کے تعصبات کو توڑا اور لوگوں میں رواداری کے جذبات پیدا ہوئے۔

ان بدلتے ہوئے حالات میں وہ طبقے جو اب تک اپنی پس ماندگی پر مطمئن تھے اور جن میں اپنی حالت کو بدلنے کی کوئی خواہش نہیں تھی' اب ان میں آگے بڑھنے اور حقوق کو حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ آج کے ہندوستان میں اچھوت لوگوں کی دلت تحریک ہے جو صدیوں کے ظلم کے خلاف آج صف آرا ہے مگر اس کی ابتداء بھی برطانوی دور ہی میں ہوئی تھی' اور ڈاکٹر امبیدکر کی شخصیت جو اچھوت لوگوں میں سے پیدا ہوئی ایسا صرف برطانوی دور میں ہی ممکن تھا' ورنہ قدیم ہندوستان کی روایات میں اچھوت لوگوں کا اس طرح سے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔

آزادی اور مساوات وہ نظریات تھے کہ جنہوں نے معاشرہ میں انسان کی عظمت' احترام' اور تقدس کو قائم کیا۔ ان نظریات نے معاشرہ میں اختلاف' کش مکش' اور تصادم کی بنیاد ڈالی اور انہیں بنیادوں پر ہندوستان میں آزادی کی تحریک ابھری۔

4

نو آبادیاتی دور کا ایک اور اہم پہلو جس نے معاشرے میں امن و امان قائم کیا وہ قانون کی بالادستی' اور عدلیہ کی آزادی تھی۔ اس نے قانون کی نظر میں ادنیٰ و اعلیٰ سب کو برابر کر دیا' اور ہر شہری کو اپنے حقوق کا احساس ہوا۔ قانون کی اس بالادستی کے ساتھ ہی پریس کی آزادی' اور سول لبرٹی نے معاشرے میں خود اعتمادی کو پیدا کیا' اور انہیں روایات اور اداروں کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی جاسکے۔ اگرچہ نو آبادیاتی حکومت نے آزادی کی تحریک کو کچلا اور قانون کی پرواہ کئے بغیر راہنماؤں کو جیلوں میں ڈالا۔ مگر

آزادی کے راہنماؤں نے انہیں کے قانون اور انہیں کی روایات و اداروں کا سہارا لے کر ان سے جنگ لڑی' اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ قانون کی پابندی کرے۔

نو آبادیاتی دور کی یہ اہم خصوصیات تھیں کہ جن کی وجہ سے وہ ہندوستان پر کامیابی کے ساتھ حکومت کر سکے اور ایک عام آدمی کو سکون اور امن کی ایسی زندگی دی کہ آج تک اس کی یادیں لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔

اسی لئے جب ہندوستان میں یورپی تعلیم یافتہ طبقے نے نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کی تو ابتداء میں انہوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے' اور نو آبادیاتی اداروں کو بالکل ختم کر دیا جائے بلکہ انہوں نے ان اداروں میں اپنی شرکت پر زور دیا اور انگریزی حکومت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی کیونکہ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ صرف انگریزی حکومت میں رہتے ہوئے ہندوستان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ سماجی' سیاسی' اور معاشی طور پر ترقی کر سکے گا اور ہندوستان ایسے ملک میں جو کئی قوموں' مذہبوں' اور ثقافتوں پر مشتمل ہے' اس میں اتحاد برقرار رہے گا۔ اس لئے ان کی یہ خواہش تھی کہ جب ملک ایک ایسی اسٹیج پر پہنچ جائے گا کہ جہاں اسے نو آبادیاتی حکومت کی ضرورت نہیں رہے گی تو اس وقت اس کی آزادی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اسی لئے ہندوستان کی قومی تحریک کا سرا دور اس وقت شروع ہوا جب انہیں نو آبادیاتی حکومت کے معاشی استحصال اور اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی پس ماندگی کا احساس ہوا۔ اس شعور کے آتے ہی ان کا مطالبہ یہ ہوا کہ ہندوستان کو مکمل آزادی ملنی چاہئے تاکہ وہ اپنے ذرائع کو استعمال کرکے ترقی کر سکے۔

14 اگست: روز حساب

14 اگست پاکستان کی آزادی کا دن ہے اور اس دن کی اہمیت اس میں ہے کہ اسے دو نقطہ ہائے نظر سے دیکھا جائے: ایک تو یہ کہ 14 اگست 1947ء وہ دن تھا کہ جب ہماری جدوجہد کی تحریک نقطہ عروج پر پہنچ کر کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور مسلمانوں نے جس علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا تھا' وہ ملک معرض وجود میں آگیا- اس دن کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لئے' جدوجہد آزادی کے دوران لوگوں نے جو قربانیاں دیں' راہنماؤں نے جن جن تکالیف کو برداشت کیا' ہندوؤں نے جس دشمنی کا مظاہرہ کیا اور انگریزوں نے جس جانبداری کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں اور ناانصافیاں کیں ان کی تفصیلات اس موثر انداز میں بیان کی جاتی ہیں کہ جس سے پڑھنے والوں میں اپنے راہنماؤں کے لئے عزت و احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں' اور وہ ان کی دانشمندی' فراست' اور عقل مندی کی تعریف کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے انہیں آزادی میسر ہوئی اور ان کی مذہبی شناخت برقرار رہی-

ایک دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ 14 اگست کو تحریک آزادی کے پس منظر میں دیکھنے کے بجائے' ان حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے کہ جو 1947ء سے اب تک ہماری سیاست' معیشت' اور سماجی زندگی میں ہوئے ہیں- اگر اس طرح سے 14 اگست کا تجزیہ کریں گے تو اب یہ دن ہماری کامیابی' فتح' اور کامرانی کی علامت کے بجائے' ہماری بدعنوانیوں' لالچ' طمع' لوٹ کھسوٹ' اور بے ایمانیوں کی تاریخ کی صورت میں ہمارے سامنے آئے گا- یہی وجہ ہے کہ سرکاری طور پر 14 اگست کا دن مناتے ہوئے اس کے 47ء سے پہلے کے حالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے- اور 47ء کے بعد جو کچھ ہوا' اسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے-

اسی لئے پاکستان کی ہر حکومت نے 14 اگست کو سرکاری طور پر شاندار طریقہ سے منا کر اس بات کی کوشش کی کہ ماضی کے کارنامے بیان کر کے اپنے جرائم کو چھپایا جائے' اور ان کی پردہ پوشی کی جائے- اس لئے یہ دستور ہو گیا ہے کہ اس دن ملک بھر میں پریڈیں ہوتی ہیں' مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں' اور لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس دن کے تقدس کو برقرار رکھیں- چراغاں' جھنڈے لہرانا' قومی ترانے گانا' اور جذبات سے بھری تقریریں کرنا' اس لئے ضروری

ہے کہ اس طرح سے لوگوں کی توجہ موجودہ مسائل سے ہٹا دی جائے' اور وقتی جذبات میں ڈوب کر لوگ اپنی غربت' بھوک' بیماری' اور دوسرے مسائل کو بھول جائیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر قومی دن کو اس وقت منایا جائے کہ جب ہم اپنے مسائل پر قابو پائیں' لوگوں کو باعزت مقام دیدیں' اور ملک میں تحفظ فراہم کریں' تو اس سے لوگوں میں فخر کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اگر یہی دن غربت و افلاس و ذلت کے بارے لوگوں کے درمیان شان و شوکت سے منایا جائے گا تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

لیکن 14 اگست کا دن ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم اپنی ماضی کی غلطیوں اور کمزوریوں کا تجزیہ کریں اور ان سے کچھ سیکھیں' اور ان بنیادوں پر اپنی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ 14 اگست مسلمان قومی پرستی کی ایک علامت اور اس کا اظہار ہے کہ اس دن برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن مسلمان قوم پرستی اور ہندوستانی قوم پرستی کئی لحاظ سے دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور دونوں کی ابتداء کی وجوہات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہندوستانی قوم پرستی نو آبادیاتی نظام کے رد عمل میں مغربی تعلیم یافتہ طبقے کی کوششوں کے نتیجہ میں ابھری۔ اس لئے ہندوستانی قومیت نو آبادیاتی نظام اور اس کے استحصال کے خلاف تھی۔ اس کے برخلاف مسلمان قومیت کی جڑ اس خوف پر تھی کہ ہندو اکثریت ان کو محکوم کرے گی۔ اس لئے وہ نو آبادیاتی نظام کے خلاف نہیں بلکہ ہندو قومیت کے خلاف تھی۔

ان دو مختلف رجحانات کی وجہ سے تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے سیاسی ڈھانچہ کی تشکیل' اور سیاسی عمل ان سے متاثر ہوا۔ ہندوستان میں سیکولر نظام کی بنیاد ڈالی گئی کہ جس میں مختلف عناصر کو دستوری تحفظات دیئے گئے' اور ملک کی غیر ملکی پالیسی کو غیر جانبدارانہ رکھا گیا۔ پاکستان میں اس کے برعکس یہ کوششیں ہوئیں کہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل کی جائے' اور اس میں ہندوؤں کے خلاف جو عنصر ہے' اسے تقسیم کے بعد بھی برقرار رکھا جائے۔ چونکہ مسلمان قومیت کے کردار میں نو آبادیاتی نظام یا سامراج کے خلاف کوئی ٹکراؤ نہیں تھا اس لئے پاکستان آسانی کے ساتھ سامراجی بلاک میں شامل ہو گیا اور یہاں تک آگے بڑھا کہ اس نے ملک اور لوگوں کی آزادی کو بھی اس پر قربان کر دیا اور ساتھ ہی ہندوؤں کے خلاف جذبات کو برابر بھڑکایا جاتا رہا۔ اگرچہ یہ ضرور ہوا کہ ہندوؤں کے خلاف جن نفرت کے جذبات کو برقرار رکھا گیا تھا اس کا فائدہ سیاستدانوں سے زیادہ فوج نے اٹھایا اور انہیں اقتدار سے علیحدہ کر کے تمام طاقت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

اس کے دوسرے نتائج یہ نکلے کہ مسلمان قومیت کی وجہ سے' پاکستانی قوم کی تشکیل سے مذہبی اقلیتوں کو خارج کر دیا گیا' جس کی وجہ سے پورا معاشرہ تنگ نظر' اور قوت برداشت سے محروم ہو گیا' اور یہ وہ رجحانات تھے کہ جنہوں نے جمہوریت کی قدروں اور اداروں کو پروان نہیں چڑھنے دیا۔ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ساتھ سیکولر' سماجی اور ثقافتی جماعتوں اور افراد کو ملک و معاشرے کی تعمیر سے علیحدہ کر کے ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا۔ یہی وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے معاشرہ میں بنیاد پرستی کو فروغ ہوا اور اس کو ریاست کی جانب سے نہ صرف تحفظ ملا بلکہ اس کی سرپرستی کی گئی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مسلم لیگ' جس نے کہ پاکستان کی تحریک کو آگے بڑھایا اور آخرکار ملک کو تقسیم کرایا۔ اس کی اپنی جماعتی تشکیل اور کام کرنے کے طریقوں نے ملک کے سیاسی نظام کو متاثر کیا۔ مثلاً مسلم لیگ میں راہنماؤں کا اس قدر تسلط تھا کہ ایک عام کارکن کو اس کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس کی کارکردگی پر اعتراض کر سکے' یا راہنماؤں کے طرز عمل پر تنقید کرتے ہوئے آواز بلند کر سکے۔ تمام سیاسی فیصلے راہنماؤں کے درمیان ہو جاتے تھے' اور اس کے مواقع نہیں ہوتے تھے کہ ان فیصلوں پر بحث و مباحثہ ہو' اور ان کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ لیگ کے راہنماؤں نے محمد علی جناح کو اپنا راہنما بنا کر فیصلے کے تمام اختیارات ان کے سپرد کر دیئے تھے' لہٰذا اس کارکردگی کے نتیجہ میں غیر جمہوری طرز فکر پیدا ہوا' جو بعد میں تقریباً ہماری تمام سیاسی جماعتوں میں جڑ پکڑ گیا۔

اس کے علاوہ لیگ نے اپنی سیاسی تحریک کو مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر آگے بڑھایا' اور معاشرہ کے اہم سماجی' اور معاشی مسائل' جن میں تعلیم' صحت' اور غربت آتے ہیں ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہی آگے چل کر پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کا منشور رہا کہ انہوں نے دستوری اور سیاسی مسائل کو اہمیت دی اور محض لوگوں کے جذبات مشتعل کر کے ان کی حمایت حاصل کی۔ اس لئے سیاسی جماعتیں تو اقتدار میں آتی رہیں مگر لوگوں کے بنیادی مسائل اسی طرح سے قائم رہے۔

لیگ نے پاکستان کے قیام کے بعد اس بات کی سنجیدگی سے کوشش نہیں کی کہ وہ معاشی ترقی اور صنعتی عمل کو تیز تر کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرے۔ اس لئے ہماری سیاسی جماعتوں میں کسی میں معاشی مسائل اور ان کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا۔

اس لئے اگر پاکستان تحریک کی جد و جہد کو ذہن میں رکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ تقسیم کے بعد سے اب تک ہمارے حکمران طبقوں نے کیا کارکردگی دکھائی' تو یہ بات واضح ہو کر سامنے

آتی ہے کہ اس پوری تاریخ میں ہمیں ان کی ناکامی اور بدعنوانی کی داستانیں ملتی ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے کس طرح سے ملک و قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا۔ عوام کے حقوق کو غصب کیا اور ملک میں جمہوری اقدار کو ابھرنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔ اس لئے 14 اگست کا دن ہمیں اس تاریخ کی یاد دلاتا ہے' اور ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ اگر ملک کو جمہوری اور سیکولر بنانا ہے تو اس کے لئے نئے سرے سے جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اقلیتیں اور تحریک پاکستان

اقلیت اور اکثریت کی کوئی ایک مکمل اور جامع تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہ تعریف وقت اور ضرورت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اگرچہ اکثریت و اقلیت کی تقسیم مذہب' فرقہ' ذات' زبان' اور نسل کی بنیادوں پر ہوتی ہے' مگر اس میں افراد کی پوزیشن تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ایک فرد ایک جگہ اکثریت سے تعلق رکھتا ہے' تو دوسری جگہ وہ اقلیت کا رکن بن جاتا ہے۔ اکثریت و اقلیت کے تضادات اس وقت ابھر کر سامنے آتے ہیں جب مفادات کا ٹکراؤ ہو۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ حکمراں طبقے جب سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو اس موقع پر لوگوں کی توجہ ہٹانے کی غرض سے انہیں اقلیتوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے اقلیتیں ہمیشہ معاشرہ میں عدم تحفظ کا شکار رہتی ہیں۔

اس مسئلہ کے حل کے لئے موجودہ دور میں قومی ریاست کی تشکیل' جمہوری اداروں اور قدروں کا فروغ' اور سیکولرازم اس بات کی کوششیں ہیں کہ قوم کی تعمیر میں مذہب' فرقہ' زبان' اور نسل کے فرق کو ختم کر دیا جائے تاکہ تمام افراد مساوی حقوق کے ساتھ قوم کی تشکیل کر سکیں۔ جن معاشروں میں قومی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد ایک قوم بنی' وہاں معاشرہ کی بکھری ہوئی قوتیں ایک جگہ جمع ہو گئیں' اور اس کے نتیجہ میں ملک نے ترقی کی' لیکن جن ملکوں میں اکثریت و اقلیت کا فرق ہے' وہاں یہ قوتیں بھی بٹی ہوئی ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستان بھی اس عمل سے دوچار ہے' اور اقلیتوں کو قومی دھارے سے ہٹا کر انہیں علیحدہ رکھا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے تاکہ اقلیتوں کو تاریخ سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ اس قسم کی تاریخ کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ اقلیتیں خود کو قومی دھارے سے علیحدہ سمجھنے لگی ہیں' اور جب وہ اس قسم کی تاریخ پڑھتی ہیں تو ان میں ایک احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب تاریخ انہیں ماضی کا کوئی ورثہ نہیں دے گی' تو ان کے لئے ماضی پر فخر کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہوگی' اور وہ خود کو اجنبی اور اچھوت سمجھنا شروع کر دیں گے۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر اقلیتوں کو قومی دھارے اور قومی تاریخ سے کیوں نکالا

جا رہا ہے' اس کی وجوہات کیا ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ کسی نئے ملک کی تشکیل نہیں بلکہ فتح تھی' اور جس طرح فاتح افواج ملک کی فتح کے بعد خود کو اس کا حقدار سمجھنے لگتی ہیں' اور اس ملک کی مال و دولت کو مال غنیمت سمجھ کر اس کی لوٹ مار میں مصروف ہو جاتی ہیں' یہی کچھ ہمارے ملک میں ہوا۔ تحریک آزادی کے کارکنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس ملک کے ذرائع کو کم سے کم کر دیا۔ اب ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ خود کو تحریک آزادی کا کارکن ثابت کرے' اور اس کے معاوضہ میں ملک کے ذرائع کو لوٹے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں محب وطن' اور غدار وطن کی اصطلاحات اس قدر عام ہیں' اور جو بھی اقتدار میں ہوتا ہے وہ مخالفین کو غدار قرار دے کر لوٹ کھسوٹ کے سارے حقوق اپنے لئے محفوظ کر لیتا ہے۔

یہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ تحریک آزادی کو بھی مختصر طور پر سمجھا جائے۔ ہندوستان میں تحریک آزادی کی ابتداء 1885ء میں کانگرس کے قیام سے ہوئی' اور کانگرس میں اس وقت ہندو' مسلمان' عیسائی' پارسی اور بدھ مت' سب ہی مذاہب کے ماننے والے شامل تھے اور یہ انہیں کوششوں کو نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں سیاسی شعور بیدار ہوا' اور انگریزوں کی حکومت کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہوا۔

اس کا دوسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوا' جب شملہ وفد' اور مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے بحیثیت اقلیت کے اپنے حقوق کی جدوجہد کی۔ اس وقت تک صرف حقوق کی بات تھی' ملک تقسیم کرنے کی بات شروع نہیں ہوئی تھی۔

ایک علیحدہ وطن کی بات 1937ء کے الیکشن اور لاہور ریزولوشن کے بعد شروع ہوئی۔

اس لئے تاریخ میں یہ اہم سوالات ہیں کہ تحریک پاکستان میں کس نے حصہ لیا؟ اور وہ کون سے عوامل تھے کہ جن کی وجہ سے ہندوستان تقسیم ہوا؟ ہمارے مورخ تو اس کا بڑا سادہ سا جواب دے دیتے ہیں کہ پاکستان کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا' اور قائد اعظم نے اس خواب کی تکمیل کر دی' لہٰذا اس پورے عمل میں کسی عوامی جدوجہد کا تذکرہ نہیں' اگر ان دو شخصیتوں کے بعد کچھ بچتا ہے تو وہ لیاقت علی خان' عبدالرب نشتر' اور چند دوسری شخصیتوں کے حصہ میں آجاتا ہے۔ اور اگر قائد اعظم کی بات پر یقین کر لیا جائے تو ان کے کہنے کے مطابق "پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا ہے" اس کے بعد تو اس تحریک سے سبھی خارج ہو جاتے ہیں اور تحریک پاکستان کے کسی کارکن کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

اس لئے جب اقلیتوں پر یہ اعتراض کیا جائے کہ انہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں

لیا' تو اس پر یہ سوال مناسب ہوگا کہ اس تحریک میں کس نے حصہ لیا؟ کیونکہ پاکستان میں تو ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اس کے دعویٰ دار ہو سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ علاقے جو آج پاکستان میں ہیں یہاں پاکستان کے حامی 1937ء کے بعد پیدا ہوئے' اور یہاں کے سیاستدانوں' زمینداروں اور پیروں نے اس وقت اس تحریک میں شمولیت کی کہ جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ تحریک کامیاب ہوگی۔ اس لئے یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ کیا ان کی شمولیت مفادات پر مبنی تھی یا وہ دل سے اس کے ساتھ تھے۔

اور پھر یہ سوال بھی ہے کہ اگر اقلیتوں نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تو کیا انہوں نے اس کی مخالفت کی! اور اگر انہوں نے حصہ نہیں لیا تو کیوں؟ کیا وہ ایک ایسی تحریک میں حصہ لیتے جو مذہبی بنیادوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہی تھی؟ کیا عیسائی' ہندو' اور پارسی ایک ایسی تحریک میں سرگرم ہوتے کہ جس میں ان کے حقوق کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں تھی؟

پھر اس چیز کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تحریک پاکستان کسی عوامی جدوجہد کا نام نہیں تھا' بلکہ یہ ایک دستوری اور سیاسی جنگ تھی کہ جس میں معاملات گفت و شنید کے ساتھ ہو رہے تھے اسی لئے اس کے جو نتائج نکلے وہ لوگوں کی توقعات کے خلاف تھے۔

پاکستان بننے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تحریک پاکستان جن بنیادوں اور نظریات پر چلائی گئی تھی' پاکستان کی تشکیل کے بعد ان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ پاکستان میں ہر مذہب' ذات' فرقہ' اور نسل کے لوگ آباد ہیں۔ اسی لئے ابتدائی دور ہی میں قائد اعظم نے اس بات کی کوشش کی کہ بیوروکریسی' فوج' اور دوسرے اداروں میں اقلیتوں کو مساوی بنیاد پر شریک کیا جائے۔ کیونکہ ایک قوم کی تشکیل اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب ہر شہری کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔

اس لئے آج پاکستان کا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسے کیسے قائم رکھا جائے؟ کیا اکثریت و اقلیت کے فرق کو مٹا کر' اور ایک قوم کی تعمیر کر کے یا اس فرق کو قائم رکھ کے' اور قوم کو مختلف خانوں میں بانٹ کر۔ اگر ایک قوم اور ایک ملک کی تعمیر کرنا ہے تو اس کے لئے جمہوری اور سیکولر اداروں کو مضبوط کرنا ہوگا۔ کیونکہ انہیں بنیادوں پر مختلف جماعتیں اور گروہ اپنے مفادات ایک کر سکیں گی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس میں ایک ایسی تاریخ کی تشکیل بھی ضروری ہے کہ جس میں اقلیت و اکثریت کا فرق نہ ہو' بلکہ جس میں سب برابر کے شریک ہوں۔

اور یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ تاریخ وہی نہیں بناتے ہیں جو حکمران ہوتے ہیں' یا جن

کے پاس سیاسی طاقت و قوت ہوتی ہے' بلکہ تاریخ بنانے میں ان لوگوں کا سب سے بڑا حصہ ہوتا ہے جو خاموشی سے اپنے پیشہ اور کام کے ذریعہ معاشرہ میں تبدیلیاں لاتے ہیں- اب تک عوام کی ان سرگرمیوں سے مورخوں نے چشم پوشی کی مگر اب تاریخ صرف حکمران طبقوں کے کارناموں کا ریکارڈ نہیں رہی- بلکہ یہ ان عوامی سرگرمیوں کا گہرائی سے جائزہ لے رہی ہے کہ جو معاشرہ کو متحرک رکھتی ہیں- اس لئے تاریخ میں ہر فرد' گروہ' جماعت کی اپنی ایک اہمیت ہے-

ہم تحریک آزادی کی تاریخ میں صرف راہنماؤں کو یاد رکھتے ہیں مگر اس میں اس عوامی کردار کو بھول جاتے ہیں کہ جنہوں نے جلسوں و جلوسوں میں حصہ لیا- پولیس کے ظلم سے اور قید و بند کی سختیاں برداشت کیں- اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان جلسوں و جلوسوں میں کس مذہب' فرقہ' ذات' اور نسل کے لوگوں نے حصہ لیا تھا- جب یہ مجمع ہوتا ہے تو اس میں نسل و ذات و مذہب سب مٹ جاتے ہیں اس وقت یہ عوام ہوتے ہیں- اور ان ہی کی حمایت اور جذبہ کی بنیاد پر راہنما بنتے ہیں اور اپنا تاریخی کردار ادا کرتے ہیں-

اس لئے ہمیں ایسی تاریخ کی ضرورت ہے کہ جس میں اکثریت و اقلیت سب کو بلا تفریق با عزت مقام دیا جائے- ورنہ کس کس کو تاریخ سے نکالا جائے گا' اور کس کس کو غدار وطن کہا جائے گا' کیونکہ اس صورت میں تحریک آزادی کے خود ساختہ کارکنوں کی ایک اقلیت بن جائے گی- جو ملک کی مظلوم اکثریت پر فاشسٹ ہتھکنڈوں کے ساتھ حکومت کرے گی' اور انہیں ان کے حقوق سے محروم کرے گی اور اس اکثریت میں ہر مذہب و فرقہ کے لوگ ہوں گے-

سندھی قوم پرستی اور مہاجر شناخت

چونکہ پاکستان مسلم قومیت کی بنیاد پر بنایا گیا تھا اس لئے اس میں تمام علاقائی اور صوبائی شناختوں کو غداری کا مترادف سمجھا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ پاکستان کے تمام صوبے اپنی شناخت ختم کر کے خود کو مسلم قومیت میں ضم کر دیں۔ لیکن ہمارے حکمرانوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ مسلم قومیت کی بنیاد چونکہ ہندوؤں کے خلاف تھی اس لئے تقسیم سے پہلے اس کا کردار اور تھا' مگر پاکستان بننے کے بعد نئے سیاسی حالات اور نئے تقاضوں کے تحت مسلم قومیت کے نظریہ کو استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ آزادی کے بعد پاکستان کے ہر علاقے اور صوبہ کو اس کی توقع تھی کہ اس کی ترقی ہوگی اور انہیں سیاسی حقوق ملیں گے' مگر غیر مساوی معاشی ترقی' اور غیر جمہوری طرز حکومت نے ان کی ان امیدوں کو ختم کر کے رکھ دیا' اور انہوں نے خود کو اسی طرح سے نو آبادیاتی نظام میں جکڑا ہوا پایا۔

لہٰذا سندھی قومیت ملک کے سیاسی نظام کی ناکامی کی پیداوار ہے کہ جو آزادی کے بعد ان کے مطالبات' اور ان کی خواہشات کو پورا نہیں کر سکا۔ اس لئے یہ مسلم قومیت کے خلاف ہے کہ جس میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ علاقائی اور صوبائی شناختوں کو ختم کر کے سب مسلمان ایک ہو جائیں۔ اور جب مذہب کی بنیاد پر ایک قوم بنانے کی کوشش ہوئی تو اس میں مذہبی اقلیتوں کو بھی خارج کر دیا گیا' اور انہیں معاشرہ میں ثانوی مقام دیا گیا۔

اس کے رد عمل کے طور پر سندھی قومیت نے اپنی بنیاد زبان اور تاریخ پر رکھی' اور وہ تمام لوگ جو سندھی زبان بولتے ہیں' انہیں مذہب' اور نسل کے فرق کے باوجود ایک قومیت میں ضم کر لیا۔ اس کے اس سیکولر رجحان کی وجہ سے سندھ کی ہندو آبادی کو سندھی قومیت نے تحفظ دیا اور یہی وجہ ہے کہ ہندو طلباء اور دانش دروں نے اس کی حمایت کی کیونکہ اس میں انہیں جو مساوی مقام ملا' وہ مسلم قومیت نے انہیں نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم قومیت کے حامیوں' اور نظریہ پاکستان کے رکھوالوں کے لئے یہ اتحاد غداری کے مترادف ہوا۔ اور انہوں نے اس پر زبردست تنقید کی' یہاں تک کہ سندھ کے ہندوؤں پر غداری کے الزامات لگائے گئے' اور انہیں پاکستان کا دشمن اور ہندوستان کا ایجنٹ بنا دیا گیا' جب کہ حقیقت صرف

اتنی ہے کہ ہر جماعت اور گروپ کو اپنی بقا کے لئے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے' اور جہاں بھی انہیں عزت دی جائے گی وہ اس نظریہ اور نظام کا ساتھ دیں گے۔

پاکستان میں سیاسی عمل کے نتیجہ میں سندھیوں کے ساتھ ساتھ دوسری چھوٹی قومیتوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اگر انہوں نے مسلم قومیت کی حمایت کی' تو اس کے نتیجہ میں انہیں ان کے حقوق کبھی نہیں ملیں گے' اور انہیں قوت و طاقت اور تبلیغ کے ذریعہ مجبور کیا جاتا رہے گا کہ وہ اپنی شناخت کو بھول جائیں اور اپنے حقوق کی کوئی بات نہ کریں۔ اس لئے مسلم قومیت کے دائرے میں رہتے ہوئے' ان کے لئے باعزت مقام حاصل کرنا ناممکن ہے۔

اس کے برعکس سندھی قومیت نے سندھیوں کو ایک علیحدہ سے شناخت دی' اور وہ اس شناخت کی بنیاد پر اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

مہاجر کیمونٹی نے بھی اس راستہ کو اختیار کرتے ہوئے' زبان کی بنیاد پر مختلف سماجی' ثقافتی' اور نسلی گروہوں کو آپس میں متحد کیا' اور اس اتحاد کو مزید مضبوط کرنے کی غرض سے انہوں نے تحریک آزادی کی تاریخ سے مدد لی۔ جس میں انہوں نے پاکستان کی تشکیل میں مہاجروں کی قربانیوں کو اجاگر کیا' اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کی تقسیم میں انہوں نے جو تکالیف' اذیتیں' اور دکھ سہے ہیں' انہیں نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ فرقہ وارانہ فسادات میں قتل عام' ہجرت کی اذیتیں' اور پاکستان کے بننے کے بعد اس کی تعمیر اور استحکام میں ان کا حصہ اہم ہے۔ اس لئے دیکھا جائے تو مہاجر قومیت نے بھی مسلم قومیت کی نفی کی' اور اپنی شناخت اس سے علیحدہ قائم کی ہے۔

لیکن ان دونوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ مہاجر شناخت کی بنیاد اس قدر وسیع اور سیکولر نہیں جیسی کہ سندھی قومیت کی ہے۔ اگرچہ یہ مسلم قومیت کو رد کرتی ہے اور اس نے مذہبی راہنماؤں اور علماء کے اثر و رسوخ کو بھی کم کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے مذہبی علامتوں کو اختیار کر کے لوگوں کے جذبات کو ابھارا ہے' مثلاً قرآن خوانی کی مجلسیں' یا جلسوں میں عورتوں کا سروں پر قرآن شریف اٹھائے ہوئے چلنا وغیرہ۔ انہوں نے کھل کر کبھی سیکولرازم کی بات نہیں کی۔

مہاجر قومیت کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے متوسط طبقے کو پہلی مرتبہ سیاست میں ابھارا' اور طبقہ اعلیٰ کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ لیکن ساتھ ہی اس کی کوئی ایسی بنیاد نہیں کہ جس میں منصوبہ بندی ہو' یا جس کی دانش ورانہ بنیاد ہو' اس لئے انہوں نے کسی پروگرام پر عمل کرنے کے بجائے' سندھ میں بسنے والی دوسری قومیتوں سے جھگڑے کئے اور آخر میں بالکل تنہا

ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے اس کا اندازہ نہیں لگایا کہ پاکستان میں ان کا تعلق ایک ایسے گروپ سے ہے کہ جس کا نسلی رشتہ کسی دوسری قومیت سے نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا منصوبہ مرتب کیا جاتا کہ جس میں دوسری قوموں سے نفرت کے بجائے' ان کے مظلوم طبقوں کو ساتھ میں ملایا جاتا' کیونکہ مہاجروں کے علاوہ دوسری قومیتوں میں سرداروں' اور جاگیرداروں کا پورا پورا تسلط ہے۔

یہی حال سندھی قومیت کا ہے کہ جو پوری طرح سے سندھ کے وڈیروں اور پیروں کے زیر اثر ہے۔ اس لئے وہ اس کو محدود رکھنا چاہتے ہیں' اور اس میں سے عوام کو خارج کرنا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے سندھی قومیت کی تحریکیں صرف سندھ کے تعلیمی اداروں میں ہیں' جہاں طالب علموں کو محدود لیڈر شپ کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس سے باہر اس کے اثرات بہت کم ہیں۔

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ سندھ کے دانش ور' اپنی قومیت کے ساتھ ہیں' اور جب بھی موقع ملتا ہے وہ اپنا مقدمہ موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اب تک مہاجر دانش ور مہاجر قومیت کا حامی نہیں ہے' اور ان میں سے اکثر یا تو مسلم قومیت کے ساتھ ہیں' یا چند سندھی قومیت کی حمایت کر کے سندھی و مہاجر مفادات کو مشترک کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ صورت حال میں' اگرچہ سندھ میں دونوں میں کش مکش اور تصادم ہے مگر ساتھ ہی سیاسی صورت حال دونوں کو ایک دوسرے کے قریب بھی کر رہی ہے اور اس کا دارومدار دونوں کے راہنماؤں پر ہے کہ وہ کس حد تک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے مشترکہ حقوق کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

مذہبی رواداری

تاریخ میں مذہبی جنونیت اور اپنے عقیدے کی سچائی پر مکمل ایمان بہت سے معاشروں میں رہا ہے' اور اسی وجہ سے مومن و کافر' موحد اور مشرک کے درمیان تقسیم کو جائز قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ایک مرتبہ جب کسی کو اپنے عقیدے کی سچائی پر ایمان ہو جاتا ہے تو اس صورت میں وہ دوسرے لوگوں کو گمراہ اور فاسق سمجھتا ہے اور انہیں سماجی و ثقافتی طور پر اپنے "دائرے" سے نکال کر دور کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کی نگاہ میں ان لوگوں کا درجہ بحیثیت انسان کے بھی گھٹ جاتا ہے۔ اس لئے ایک طرف اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ انہیں تبلیغ کے ذریعہ یا تشدد کے ذریعہ اپنی سچائی پر ایمان لانے پر مجبور کرے اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو اس صورت میں ان پر تشدد' و اذیت' اور سختی کر کے انہیں ذلیل و خوار کرے۔

اسی طرح اگر کوئی فرد ان کے عقیدے کو تسلیم کرنے کے بعد' اس سے انحراف' یا اس سے نکل کر دوسرے عقیدے کی سچائی تسلیم کرے تو ایسے شخص کے لئے سخت سزا اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے اس عمل کو غداری سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ غداری جماعت کو کمزور کر کے اسے دوسروں کی نظروں میں حقیر کرتی ہے۔

انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں عقیدہ کی یہ سختی نہیں تھی۔ ہر قبیلہ اور جماعت کے اپنے اپنے دیوی اور دیوتا ہوتے تھے' اور ان کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے اگر ضرورت پڑتی تھی تو وہ دوسروں کے دیوی و دیوتاؤں کو بھی اپنا لیتے تھے۔ لیکن جب بڑی سلطنتیں قائم ہونا شروع ہوئیں' اور ان سلطنتوں نے فتوحات کے بعد مختلف قبائل اور اقوام کو اپنے اندر ضم کرنا شروع کر دیا' تو سیاسی طور پر اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ دیوی اور دیوتاؤں کی تعداد محدود کر دی جائے تاکہ سلطنت کی تمام رعیت ایک قسم کے دیوتاؤں کی پرستش کرے' اور اس طرح سے سیاسی اتحاد کے ساتھ ساتھ ان میں مذہبی اتحاد بھی قائم رہے۔ کیونکہ مذہبی اتحاد کی وجہ سے ان کی وفاداریاں ریاست و حکمراں کے ساتھ ہو جائیں گی اور بغاوت کے خطرات کم ہو جائیں گے۔

اسی لئے دنیا میں بڑے بڑے مذاہب کو حکمرانوں اور بڑی سلطنتوں نے اپنے سیاسی مقاصد

لئے استعمال کیا۔ اشوک نے بدھ مذہب کو اختیار کر کے اپنے سامراجی عزائم کو پورا کیا۔ تو
سٹنٹین اعظم نے عیسائیت کو اختیار کر کے اور رعایا کو عیسائی بنا کر اپنی ریاست کو مستحکم کیا۔
ی تاریخ میں صفویوں نے ایران کی فتح کے بعد شیعہ مسلک کو زبردستی پھیلایا اور ایران کی
آبادی جو اکثریت میں تھی' اسے شیعہ بنا کر ازبکوں اور عثمانیوں کے خلاف اپنا دفاع کیا۔
جب ریاست مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے' تو وہ ہر تشدد اور سختی
جائز قرار دیتی ہے اور حکمران اداروں کی مدد سے دوسرے مذاہب کو ختم کر کے' لوگوں کو
ر کرتی ہے کہ ریاستی مذہب کو اختیار کیا جائے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کچھ
رے داروں نے بھی اس بات کی کوشش کی تھی کہ اہل ہندوستان کو عیسائی بنا لیا جائے تاکہ
ی وفاداریاں مذہب کی بنیاد پر تاج برطانیہ سے وابستہ ہو جائیں۔
مگر 1857ء کے ہنگامہ کے بعد انہوں نے ان کوششوں کو کم کر دیا اور مشنریوں کی ریاستی
ر پر امداد کم کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کامیاب رہی کہ اس نے
اں کے مذہبی معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیا اور اس بنیاد پر علماء نے انگریزی اقتدار کے
جود اسے دارالحرب قرار نہیں دیا۔ کیونکہ انہیں ان کی حکومت میں مذہبی آزادی تھی۔
اور یہی صورت حال ہندوستان میں مسلمان خاندانوں کے دور حکومت میں رہی۔ انہیں
روستان کے حالات کے تحت مذہب اور سیاست کو علیحدہ کر کے مذہبی رواداری کے اصولوں پر
ں کرنا پڑا۔ کیونکہ ہندوستان ایک ایسا ملک تھا کہ جس میں کئی مذہب اور نسلوں کے لوگ آباد
ے۔ اور ان لوگوں کا تعاون اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا کہ جب انہیں عقیدہ کی پوری پوری
ادی دی جائے' اسی لئے ان کی حکومتوں میں مسلمان' ہندو' اور عیسائی سب ہی شریک تھے۔
دوؤں کے کایستھ طبقے نے انتظامی امور میں حکومت کی بڑی خدمات سرانجام دیں اور یہی کچھ
ندھ میں ہوا کہ یہاں پر ہندوؤں کے عامل طبقے نے مسلمان حکمرانوں کے دربار میں وفاداری
کے ساتھ ملازمتیں کیں۔
خصوصیت سے مغل زوال کے بعد جب ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں وجود
ں آئیں تو ان ریاستوں کے ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے دربار میں ہر مذہب کے ماننے والے
تھے۔ میسور' بنگال' حیدر آباد' دکن' اور اودھ کی ریاستوں کی مثالیں کافی ہیں کہ جن کے اعلیٰ
رے دار ہندو تھے۔ اور یہ سب اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ اس وقت معاشرہ میں مذہبی
رواداری تھی' اور کسی کو اس کے عقیدے کی بنیاد پر نہ تو کم تر سمجھا جاتا تھا' اور نہ اسے عقیدہ
رلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی اور ثقافتی تعلقات کی وجہ سے مذہبی

رواداری پیدا ہو گئی تھی' اگرچہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ کا پکا کھانا نہیں کھاتے تھے' او
شادی بیاہ کے موقعوں پر علیحدہ ہندو و مسلمان باورچی کھانا پکاتے تھے مگر ان باتوں کو مذہبی
ضرورت سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے تھے۔
کیونکہ نفرت اور علیحدگی کی صورت میں سماجی و ثقافتی تعلقات متاثر ہوتے اور معاشرہ کی ہم
آہنگی برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے مذہبی رواداری وقت کی ضرورت بن گئی تھی۔

صورت حال اس وقت بدلی کہ جب پاکستان کی تحریک کو مذہب کے نام پر چلایا گیا۔ اگرچہ
اس تحریک کے پیچھے سیاسی اور معاشی مقاصد تھے مگر ان مقاصد کے حصول کے لئے مذہب
استعمال کیا گیا اور ایک عام مسلمان کو یہ تاثر دیا گیا کہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان اپنے
مذہب اور عقیدہ کا تحفظ نہیں کر سکیں گے اور نہ اپنے مذہبی فرائض کو آزادی سے سرانجام
دے سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب پاکستان بنا تو عام مسلمانوں میں یہ خیال تھا کہ یہ
صرف مسلمانوں کے لئے ہے اور یہاں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں
ہے۔ یہیں سے مذہبی تعصب اور نفرت کی ابتداء ہوئی۔

اس کے علاوہ جیسے جیسے ہماری سیاسی لیڈر شپ لوگوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام
ہوتی چلی گئی۔ اسی طرح اس نے مذہب اور نظریہ پاکستان کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں جو نصاب بنایا گیا' اس میں خصوصیت سے ذہنوں میں یہ بٹھایا
گیا کہ صرف ہم سچائی پر ہیں اور باقی تمام عقیدے باطل اور فاسق ہیں۔ یہی کچھ ٹی۔ وی اور
ریڈیو کے ذریعہ ہوا' چنانچہ ایک عام شہری کے ذہن میں یہ خیالات پختہ ہو گئے ہیں کہ ہندو اور
مغرب کے ممالک ہمارے دشمن ہیں اور یہ سب مل کر مسلمانوں کی تباہی کے سامان پیدا کر
رہے ہیں۔ اس لئے ہماری ہر ناکامی کے پیچھے ہندو' یہودی' اور عیسائیوں کی سازش چھپی ہوئی
ہے۔ سازش کی اس تھیوری کی وجہ سے لوگوں میں ہر برائی سے نفرت پیدا ہوتی ہے' ہر غیر
مسلمان میں اسے اپنا دشمن چھپا نظر آتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں بھی مذہبی تنگ نظری اور جنونیت کا دور دورہ تھا' مگر وہاں ذہن
کو بدلنے کی ابتداء رینا ساں کے دور سے شروع ہوئی اور معاشرہ میں سماجی و ثقافتی اور معاشی
طور پر اس وقت تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں کہ جب سرمایہ داری نے آہستہ آہستہ پرانے
جاگیردارانہ اداروں اور اقدار و روایات کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ فنی تبدیلیوں سے سماجی رشتوں
میں تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں' شہروں کی آبادی بڑھی تو اس نے دیہاتی آبادی کے پختہ سماجی
نظام کو توڑ دیا' اور فرد کو شہر میں گمنام کر کے اس شناخت کو جم غفیر میں ملا دیا۔ لہذا اس کے

روایاتی معاشرہ کے تمام ڈھانچہ کو بدل دیا- زندگی کے ہنگاموں میں انسان اور انسان کے تعلقات معاشی اور سماجی طور پر مضبوط ہوئے اور مذہبی طور پر کمزور- جرمنی کے مشہور مورخ ارنسٹ ٹریلیٹش نے اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرمایہ داری کے پھیلاؤ سے چرچ اور اس کے ماننے والوں کے تعلقات کمزور ہو جائیں گے' اور اس صورت میں یونیورسل چرچ اپنے تسلط کو برقرار نہیں رکھ سکے گا- ایک دوسرے مصنف جارج ژمل نے اس کی نشان دہی کی تھی کہ جدید سماجی اور ثقافتی رجحانات' سرمایہ داری کا بڑھنا' اور شخصی طور پر ہر فرد کی اپنی شناخت کا ابھرنا' مذہب کی ان بنیادوں کو ختم کر دیں گے کہ جن پر اس کا انحصار ہے-

اس مغربی تہذیب میں جب جمہوری اقدار کا فروغ ہوا تو اس میں آہستہ آہستہ فرد کی اہمیت بڑھتی گئی اور اس کی سیاسی اہمیت نے اس کے مذہب اور عقیدے کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا- اور جب قومی ریاست کا نظریہ مضبوطی کے ساتھ ابھرا تو اس نے قوم کی تشکیل زبان' نسل' اور ایک جغرافیائی حدود میں رہنے والوں کی بنیاد پر کی' مذہب کے نام سے نہیں- اس نے ریاست کے ہر فرد کو معاشرہ میں مساوی مقام دیا اور اس کی شناخت اس کی قوم سے ہونے لگی- جس کی وجہ سے مذہبی شناخت کی اہمیت ختم ہو گئی-

چنانچہ یورپ کی تاریخ میں مذہبی رواداری کو قائم کرنے' اور مذہبی شناخت کو ختم کرنے میں قومی ریاست کے قیام' اور جمہوری اداروں کے فروغ کو بڑا دخل ہے- ان ہی کی وجہ سے یورپ کا معاشرہ سیکولر ہوا اور ریاست نے خود کو مذہب سے جدا کر کے اسے لوگوں کا نجی معاملہ قرار دیدیا-

اس مختصر سے جائزہ کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے امکانات ہیں کہ پاکستان بھی اس عمل سے گزرے گا- اور کیا سرمایہ داری اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ جو فنی تبدیلیاں آئیں گی وہ ہمارے سماجی رشتوں کو بدلیں گی- اور کیا جمہوری ادارے اور روایات مذہبی شناخت کو کمزور کریں گے؟

یہ ممکن ہے' مگر یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہمارا جاگیردارانہ معاشرہ کمزور ہو گا' اور جب جاگیردارانہ روایات ٹوٹیں گی- کیونکہ اس وقت جاگیردارانہ اداروں اور مذہب کے درمیان زبردست رشتہ ہے جو ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہیں- اسی وجہ سے ہماری جمہوریت بھی جاگیردارانہ ہے' کہ جس میں جاگیردار انتخابات میں کامیاب ہوتے ہیں- اور جمہوری اداروں کو اپنے طبقاتی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں- اس کی مثال ہماری اسمبلیوں کی کارروائی سے ہو سکتی ہے کہ جس میں وہ تمام قوانین منظور ہوئے کہ جو معاشرہ کو

مسلسل پیچھے کی جانب دھکیل رہے ہیں۔

اور یہی کچھ فنی تبدیلیوں کا ہے کہ اس وقت لاؤڈ اسپیکر' ٹی-وی' ریڈیو' وڈیو اور کمپیوٹر سب کا استعمال بنیاد پرست جماعتیں زور شور سے کر کے اپنے عقائد کی تبلیغ کر رہی ہیں۔ اپنے پیغام کو شہروں شہروں اور گاؤں گاؤں پہنچا رہی ہیں۔ چنانچہ معاشرہ کی سماجی اور ذہنی کے تبدیل نہ ہونے کی وجہ سے جمہوری ادارے اور سائنس و فنی آلات معاشرہ کو گمراہ کر اور ان میں تنگ نظری و جنونیت پیدا کرنے کے کام آرہے ہیں۔ بلکہ اس ماحول میں یہ دو راستے حکمران طبقوں کے ہاتھ میں خطرناک ہتھیار ہیں کہ جن سے وہ اپنے ہر عمل کو جائز دیتے ہیں اور اپنی پوزیشن کو مضبوط و مستحکم بناتے ہیں۔

ان حالات میں ایسا نظر آتا ہے کہ حکمراں طبقے اور مذہبی جماعتیں اپنی ناکامیوں پر ڈالنے اور خود کو مقبول بنانے کے لئے مذہبی جذبات کو بھڑکاتے رہیں گے اور ان کا نشانہ مذ اقلیتیں رہیں گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ ان کے اس سے اقلیتوں میں بے چینی پھیل رہی ہے اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو رہی ہیں جس کے میں معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور معاشرہ کٹ کر کئی حصوں میں تقسیم ہو ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک ٹوٹا ہوا معاشرہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا ہے کہ وہ دفاع کر سکے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ اقتدار کی بنیادوں کو مذہبی تنگ نظری پر رکھنا چا ہیں۔ اور اس کی جگہ سیکولر روایات و اداروں کو قائم کرنا نہیں چاہتے کہ جو مساوی بنیادوں تمام شہریوں کو متحد کر کے ان کے سماجی' سیاسی اور معاشی رشتوں کو مضبوط کرتا ہے۔ معاشر اس ہم آہنگی سے ایک مشترکہ ثقافت پیدا ہوتی ہے جو کسی بھی قوم کی شناخت کے لئے ضرو ہے۔

انٹرویو

(ملاقات: تنویر قیصر شاہد انٹرویو برائے قومی ڈائجسٹ)

ٹوئٹے انسٹی ٹیوٹ گلبرگ کی ایک بغلی گلی کے ایک عظیم الشان بنگلے کی شکل میں کھڑا ہے۔ 13 نومبر کی دوپہر کو اس کے نئے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقات کے لئے پہنچا' تو وہ اپنے پرشکوہ کمرے میں سادہ سی سیاہ پتلون اور چار خانہ دار قمیض میں ملبوس بیٹھے تھے۔ تپاک سے ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں__ استاد' اخبار نویس' سیاح' مورخ! بحیثیت تاریخ دان' ان کی شخصیت' ان کی تصنیفات کی طرح متنازعہ ہے۔ وہ ڈیڑھ درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

برصغیر کی تاریخ کے کئی نازک مقامات و معاملات کی خامہ کشی میں ان کے قلم نے کئی مقامات پر جو' جولانیاں دکھائی ہیں' اس حوالے سے کوئی انہیں انقلابی کہتا ہے' کوئی باغی' کوئی سرکش' کوئی کچھ اور کوئی کچھ۔ بہت سوں کے نزدیک ان کے مضبوط الفاظ کنفیوژن پیدا کرنے کی ایک فنکاری ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی جو کچھ بھی ہیں' اپنا کام تسلسل سے کرتے جا رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

راجستھان' بھارت' کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے' ٹونک' یہاں کسی زمانے میں اردو اور فارسی کے معروف نقاد حافظ محمود شیرانی رہائش پذیر تھے۔ یہیں ان کے نامور شاعر بیٹے اختر شیرانی نے جنم لیا۔ برصغیر پر انگریزوں کا نیا نیا مکمل قبضہ ہوا تھا اور یہ بڑی ہی ابتری کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں امیر خاں نامی ایک شخص نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری اس کا پیشہ بن گیا تھا اور یہ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ امیر خاں نے انگریزی فوج سے بھاگے ہوئے مسلمان اور سکھ فوجیوں کو اپنے گروہ میں شامل کرکے بے پناہ طاقت پکڑ

لی تو آخر کار انگریزی حکام نے راجستھان کے اندر ایک اور چھوٹی سی ریاست ٹونک تشکیل دے کر اسے مکمل طور پر امیر خاں کے سپرد کر کے' اسے اس کا نواب بنا دیا۔ یہ ریاست جے پور کے زیادہ نزدیک ہے۔ امیر خاں نے اپنی ریاست میں امن و امان قائم کرنیکے بعد وہاں بہت سے نامور ادیبوں' شاعروں اور موسیقاروں کو اکٹھا کر لیا۔ رفتہ رفتہ یہ ریاست علم و ادب کا گہوارہ بن گئی۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد جو قصباتی کلچر فروغ پایا' اس میں ٹونک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دہلی کی سلطنت ختم ہونے کے باوجود یہ کلچر ختم ہونے کے بجائے پورے ہندوستان میں پھیل گیا اور متحدہ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نوابوں اور مہاراجوں کی سرپرستی میں اردو علم و ادب کو بہت فروغ ملا۔ ریاست ٹونک اس خدمت میں پیش پیش تھی۔

میری پیدائش اسی ریاست میں 1941ء میں ہوئی۔ میرے دادا سنبھل ریاست سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ میرے والد کا نام مسعود علی خاں تھا اور والدہ کا نام بتول بیگم! والدہ کا خاندان کسی زمانے میں قصور سے ہجرت کر کے ٹونک چلا آیا تھا۔ گویا میرا ننھیال قصور ہے۔ میرے نانا مولوی مالک تھے جو ریاست ٹونک کے نواب صاحب کے استاد تھے۔ والدہ کا خاندان علم و فن کا پجاری تھا اور والد کا خاندان حرب و ضرب سے متعلق پیشہ سے وابستہ رہا جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہیں۔ والد صاحب' نواب سعادت علی خاں کے ہاں ملازم تھے۔ اس ریاست کے آخری نواب کا نام نواب واجد علی خاں تھا۔

ٹونک میں اسلامی درس و تدریس کا ایک بہت بڑا ادارہ تھا جس کا نام "مدرسہ خلیلیہ" تھا۔ اس کے مہتمم اور سربراہ مولانا برکات احمد تھے جو اپنے دور کے جید عالم اور بلند پایہ محقق تھے۔ ان کے شاگرد ان کے نام کی مناسبت سے بڑے فخر سے "برکاتی" لکھتے ہیں۔ افغانستان' ملایا' وسط ایشیا اور پورے ہندوستان سے طالب علم مدرسہ خلیلیہ میں تعلیم حاصل کرنے آتے۔ میری تعلیم کا آغاز بھی اسی مدرسے سے ہوا۔ ابتداء قرآن شریف سے ہوئی۔ پھر مروجہ علوم میں کریما' گلستان و بوستان' اور دیوان حافظ پڑھایا گیا۔ اس ادارے کے اساتذہ اپنے اپنے مضمون کے ماہر فن خیال کئے جاتے تھے۔ 47ء میں جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور پاکستان معرض وجود میں آیا' تو اس ہنگامہ دار و گیر کا ایک فیصد اثر بھی ٹونک پر نہ پڑا۔ بلکہ اگر میں یوں کہوں کہ 47ء میں جب پاکستان بن رہا تھا' اور پورے ہندوستان میں قتل و غارت کا ایک منہ زور طوفان امنڈ آیا تھا' مگر ٹونک میں ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ہندوستان نفرت و فساد کی اس آگ میں کود پڑا ہے' تو شاید بے جا نہ ہو گا۔ ہم اپنے پورے خاندان سمیت ٹونک سے ہجرت کر کے' 1952ء میں' پاکستان چلے آئے اور حیدر آباد کے "ہیرا آباد" محلے میں آباد ہو گئے۔ یہ محلہ ہندو بزنس

کمیونٹی کا تھا۔ اس وقت یہ شہر بڑا پر سکون اور پر امن تھا۔ اکثریت اردو بولنے والوں کی ہو گئی تھی۔ سندھی آبادی کے لحاظ سے کم تھے اور وہ پرانے محلوں میں آباد تھے۔ مثلاً عامل محلہ ان کا معروف علاقہ تھا۔ یہ بھی خوبصورت محلہ تھا۔ یہاں رہنے والے ان سندھیوں کی تعداد زیادہ تھی جو پہلے میروں اور بعد ازاں انگریزوں کے زمانے میں انتظامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ریونیو اکٹھا کرنے کا شعبہ انہی لوگوں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ ایک محلہ کراچی میں اسی نام سے ہے۔

اس وقت حیدر آباد میں تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا کہ تقسیم سے پہلے یہاں کے تعلیمی اداروں کا تعلق بمبئی سے تھا۔ میٹرک گیارہ سال کا ہوتا تھا' چنانچہ جب میں ٹونک سے ہجرت کرکے حیدر آباد آیا اور یہاں کے سکولوں میں داخلہ لینے کی کوشش کی تو مجھے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا کہ میرے پاس اسلامی علوم کی چند سندیں تو تھیں مگر یہاں کے معیار کے مطابق کوئی مستند سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ آخر کار خالد میموریل ہائی سکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ یعقوب صاحب بی اے میرے ذہن میں ہمیشہ کے لئے یاد رہنے والے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے ہائی سکول تک بالخصوص میری بہت مدد کی۔ پیسے لے کر ٹیوشن پڑھانے کی لعنت اس وقت تعلیمی اداروں اور اساتذہ کے گھروں میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ یعقوب صاحب بغیر پیسے کے ہمیں سکول کے بعد بھی' بسااوقات' پڑھاتے۔ "بی۔ اے" بڑے فخر سے لکھتے کہ اس زمانے میں یہ ڈگری کم لوگوں کے پاس تھی اور بڑا اعزاز تصور ہوتی تھی۔ 1957ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد سٹی کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ سٹی کالج شام کا کالج تھا۔ گھر میں معاشی تنگ دستی کی وجہ سے میں صبح کو ایک پرائمری سکول میں پڑھاتا اور شام کو اس کالج میں پڑھنے جاتا۔ ٹونک سے آنے کے بعد والد صاحب کے پاس جو جمع شدہ پونجی تھی' اسے انہوں نے چھوٹی سی تجارت میں لگا دیا مگر تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ تجربہ فلاپ ہو گیا اور ہمارا خاندان شدید مالی بحران کی لپیٹ میں آتا چلا گیا۔ پرائمری سکول جس میں میں صبح کو پڑھاتا تھا' ایک پرائیویٹ ادارہ تھا مگر یہاں کی ملازمت نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ سٹی کالج اپنے انگریزی' اردو اور سندھی مباحثوں کی وجہ سے ملک بھر میں بڑی شہرت کا حامل تھا۔ مجھے ہر قسم کے مباحثوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ یہ مباحثے بین الصوبائی ہوتے تھے اور تمام صوبوں کے طلباء میں اخوت و محبت کے اضافے کا سبب بنتے۔ اب یہ مواقع نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں' اسی وجہ سے باہمی محبتوں میں بھی کمی آگئی ہے اور دلوں کے مابین فاصلے بڑھ گئے ہیں اور بڑھ رہے ہیں۔ سٹی کالج سے فرسٹ پرائز حاصل کرنا بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ اس کالج میں میں نے سٹوڈنٹس یونین کے الیکشنوں میں بھی حصہ لیا۔ فرسٹ ایئر میں "کلاس اول" کا نمائندہ

منتخب ہوا تھا۔ بی اے میں میں یونین کا وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوا۔

سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں، ہمارے زمانے میں، باہر سے آکر کالج میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جرات نہ کسی سیاسی جماعت کو ہوتی تھی نہ کسی مذہبی جماعت کو۔ یہ خالصتاً" طلباء کا اپنا معاملہ ہوتا تھا۔ مگر اب حالات بالکل الٹ ہیں۔ صرف اسلامی جمعیت طلباء کا ایسا گروپ تھا جو بہ حیثیت جماعت الیکشن میں حصہ لیتا تھا۔ اس کے علاوہ باقی سب گروپ وقت کی پیداوار ہوتے تھے۔ الیکشن کا موسم گزرنے کے ساتھ ہی یہ ختم ہو جاتے اور باہمی رنجشیں، جو الیکشن کی پیدا کردہ ہوتی تھیں، معدوم ہو جاتیں۔ میں جس پلیٹ فارم سے مسلسل کامیاب ہوتا رہا، اس کا نام ریڈیکل گروپ تھا۔ ہمارے پرنسپل مرزا عابد عباس، جو بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے، یونین ایکٹیوٹو کو سراہتے۔ کہا کرتے تھے۔ "یہ سرگرمیاں طلباء کی لئے اتنی ہی ضروری ہیں جتنی زندہ بدن کے لئے خون کی ضرورت ہے۔" سٹی کالج حیدر آباد میں ایک ادبی تنظیم بھی ہوتی تھی۔ "بزم احباب" اس کا نام تھا۔ ہر ہفتے باقاعدہ اس کا اجلاس ہوتا میں کئی برس تک اس ادبی تنظیم کا سیکرٹری جنرل رہا۔

ایف اے اور بی اے میں میرے مضامین تاریخ اور اردو ادب رہے۔ پہلے ارادہ تھا کہ اردو میں ایم اے کروں گا مگر بی اے کے آخری سال میں پہنچتے پہنچتے ارادہ بدل گیا۔ میں نے ایم اے ہسٹری کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میرے ارادے کو بدلنے میں میرے استاد تفضل داؤد صاحب نے بنیادی اور اہم کردار ادا کیا۔ داؤد صاحب تاریخ کے زبردست سکالر تھے۔ ان کی تاریخ دانی اور تاریخ نویسی کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں: انڈیا کے معروف مورخ جادو ناتھ سرکار نے ایک کتاب SHIVA JEE THE GREAT لکھی۔ جس زمانے میں یہ کتاب معرض وجود میں آئی، اس وقت ہندوستان (متحدہ) کے دونوں بڑے فرقوں کے درمیان فسادات عروج پر تھے۔ یہی عنصر، جسے تعصب کا نام دیا جا سکتا ہے، مذکورہ کتاب میں بھی در آیا۔ جادو ناتھ سرکار نے شیوا جی کو ہندوؤں کا ہیرو قرار دیتے ہوئے اورنگ زیب عالمگیر کی مذمت کی۔ "شیوا جی دی گریٹ" کے مقابلے میں میرے استاد جناب تفضل داؤد نے REAL SHIVA JEE لکھی جس سے ہندوستان بھر میں ہندوؤں کی طرف سے ان کے خلاف غصہ و نفرت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ان پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے جن کی وجہ سے وہ مجبور ہو کر، کئی برس بعد، پاکستان چلے آئے۔

تفضل داؤد صاحب سے میں بڑا متاثر تھا۔ ان کی تاریخ دانی نے مجھے کچھ اس شدت سے متاثر کیا کہ میں نے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کرنے کی ٹھان لی۔ داؤد صاحب کو پاکستان

کے معاملات میں بھی بڑی گہری دلچسپی رہی۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب جب اندرا گاندھی کے ساتھ شملہ معاہدہ کرنے جا رہے تھے تو داؤد صاحب نے انہیں ایک طویل خط لکھا جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ معاہدے کے دوران کن کن تاریخی اور ثقافتی باتوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ بھٹو اس خط سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے داؤد صاحب کو اس خط کا جواب دیا' جس میں کہا گیا تھا کہ وہ معاہدے کے ڈرافٹ میں ان کے مشوروں کو ضرور سامنے رکھیں گے۔

1961ء میں بی اے کرنے کے بعد میں نے سندھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں داخلہ لے لیا۔ یہ کلاسیں صبح کی تھیں۔ مجبوراً" سکول کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ ہمارے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب تھے جو خود ایک بہت بڑے ریاضی دان ہیں اور اقبالیات شناسی میں ان کا ایک مخصوص مقام ہے۔ خوش قسمتی سے یونیورسٹی میں مجھے احمد بشیر صاحب ایسا مورخ استاد ملا جن کے بارے میں بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجسمہ تاریخ تھے۔ پاکستان میں بہت کم ایسے تاریخ کے استاد ہوں گے جیسے بشیر صاحب کہ تاریخ ان کے سامنے یوں کھلتی چلی جاتی تھی جیسے ہاتھ کی ریکھیں! اسی سال ریٹائر ہونے کے بعد وہ قصور میں انتقال کر گئے۔ ان کا اپنا ذاتی شاندار کتب خانہ تھا۔ "اکبر کی مذہبی پالیسی" ان کی تحقیقی کتابوں میں سے ایک ہے۔

یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں ہم نے طلباء سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایوب خان کے خلاف جب طلباء نے تحریک چلائی' تو میں اس میں پیش پیش تھا۔ ایوب خان کے خلاف صف آراء کراچی یونیورسٹی کے سات طلباء رہنماؤں (جوہر حسین' معراج محمد خان' فتح یاب علی خان' حسین نقی وغیرہ) کو انتظامیہ نے شہربدر کیا تو یہ لوگ سیدھے حیدر آباد آئے تھے۔ ہم نے ان کا زبردست استقبال کیا اور انہیں پھولوں سے لاد کر شہر بھر میں جلوس نکالا۔ مگر میں یہ بات یہاں کہتا چلوں کہ اس وقت طلباء جمہوری حقوق' انسانی حقوق اور سوشل اشوز (SOCIAL ISSUES) پر بات کرتے تھے' ان کے لئے تگ و دو کرتے تھے۔ آج کے طلباء کی طرح جگا ٹیکس وصول نہیں کرتے تھے۔ ہمارے زمانے کے طلباء کے جلسے جلوسوں کا مقصد وحید یہ تھا کہ سوسائٹی کو اس طرح بدلا جائے کہ یہ پورے پاکستان کے عوام کے لئے بہتر بن جائے۔ یہ مقصد سب لوگوں پر واضح تھا۔ لوگ ہم سے تعاون کرتے' ہماری ہمت افزائی کرتے۔ عوام اور طلباء کے درمیان ایک دلکش اور پائیدار رشتہ تھا مگر اب تناظر بدل گئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں طلباء کو بے راہ کرنے کی ابتدا ایوب خان نے کی۔ ایوب کو طلباء سے بڑا خوف تھا۔ وہ سیاست دانوں کو تو دبا سکتے تھے' ان کی پارٹیوں پر پابندیاں عائد کر سکتے تھے' انہیں "EBDO" کے نام سے معذور اور معزول کیا جا سکتا تھا.... مگر طلبا کے طوفان کو روکنا ان کے بس کی بات نہ

تھی۔ طلباء ہی وہ طبقہ تھا جو ان کے خلاف تحریک چلا سکتا تھا۔ پھر اس زمانے میں یہ قانون تھا کہ ہیڈ ماسٹر' پرنسپل اور وائس چانسلر کی اجازت کے بغیر پولیس تعلیمی اداروں میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ ایوب خاں نے یہ ظلم کیا کہ سب سے پہلے طلباء یونینوں پر پابندی لگا کر انہیں مفلوج کرنے کا اقدام کیا۔ پھر پولیس کو یہ اختیار بھی بخش دیا کہ وہ تعلیمی ادارے کے سربراہ کی اجازت کے بغیر ہر درسگاہ میں داخل ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑا انتشار پیدا ہوا۔ پولیس نے ہوسٹلوں پر چھاپے مارے' اساتذہ اور طلباء کو بے عزت کیا۔ این ای ڈی یونیورسٹی میں پولیس ایکشن کے نام سے جس طرح پولیس حکام نے طلباء اور اساتذہ کی تذلیل کی' اس سے سندھ بھر میں ایوب آمریت کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پنپنے لگے۔ پھر ایوب کے امریکی مشیروں نے انہیں مشورہ دیا کہ یونیورسٹی کیمپس کو شہروں سے باہر منتقل کر دیا جائے تاکہ طلباء کا عوام سے رابطہ منقطع ہو جائے۔ اس مشورے پر فوری طور پر عمل ہوا' چنانچہ کراچی یونیورسٹی' پنجاب یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کو فی الفور شہروں سے باہر منتقل کر دیا گیا۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے یہ یونیورسٹیاں بھی رفتہ رفتہ شہروں ہی کا حصہ بنتی جا رہی ہیں مگر اس وقت ایوب کے پیش نظر منصوبہ کچھ اور تھا اور وہ اس میں پورا پورا کامیاب ہوا۔ طلباء کو جبری طور پر سیاست سے دور رکھنے کا مذموم عمل سب سے پہلے ان ہی نے شروع کیا تھا۔

ایوب خان نے تو' اپنے تئیں' اپنا دور کامیابی سے گزار لیا مگر ان کے اقدامات سے پاکستان کی سیاسی' سماجی اور تعلیمی زندگی پر بڑے ہی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ چونکہ سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد تھیں' اس لئے ان پارٹیوں نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے چور دروازے نکال لئے۔ پولیٹیکل پارٹیوں نے اپنی اپنی جماعتوں کے طلباء ونگ تعلیمی اداروں میں داخل کئے۔ یہاں سے پاکستان کی تاریخ کے اس باب کا آغاز ہوتا ہے جب سیاسی جماعتوں نے تعلیمی اداروں میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ انتہائی خطرناک عمل تھا جس کے نتائج جلد ہی سب کے سامنے عیاں ہونے لگے۔ سیاست دان اور سیاسی جماعتیں تعلیمی اداروں میں اپنی PENETRATION ہی سے اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتے تھے۔ تعلیمی اداروں میں چونکہ طلباء یونین پر پابندی تھی' اس لئے ان پولیٹیکل ونگز کو خوب کھل کھیلنے کے مواقع میسر آتے گئے اور انہوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں..... رفتہ رفتہ سیاسی جماعتوں کے ان سٹوڈنٹ ونگز کی دلچسپیاں بھی بدلنے لگیں۔

یہ بات اپنی جگہ بڑی دلچسپ اور پر الم ہے۔ کہا جاتا ہے طلباء اب صرف سیاست میں

حصہ لے رہے ہیں۔ مگر میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ یحییٰ' بھٹو اور ضیاء الحق کے زمانے میں انہوں نے سیاست کے سوا ہر دوسرے کام میں حصہ لیا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں انہوں نے جمہوریت کی بحالی کے لئے کوئی مظاہرہ' کوئی تگ و دو نہ کی' انہوں نے انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی۔ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ عمل صرف یہی رہا کہ اپنے طلباء ساتھیوں کو رہا کروایا جائے' مخالف طلباء تنظیم کا قلع قمع کیا جائے' ہوسٹلوں پر قبضہ گروپ کے ذریعہ قبضہ کیا جائے' انہوں نے اپنی منفی طاقت سے امتحانات میں نقل کو فروغ دے کر اپنے ساتھیوں کو پاس کروانے کی کوششوں پر عمل کیا' اساتذہ پر دباؤ ڈال کر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کام کئے۔ سیاست مفقود رہی' باقی سب کام موجود رہے۔ یہ وہ فصل ہے جس کا بیج آمر ایوب خاں نے بویا تھا۔ پاکستان کی مستقبل کی نسلیں اس کا مزید تلخ پھل چکھیں گی۔ اب طلباء کے مظاہروں پر عوام ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ تعمیری گروہ نہیں' تخریبی عناصر کا ٹھمگٹا ہے' لوگ ان پر غنڈوں کا لیبل لگاتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ آمریت نے انقلاب لانے والے اس موثر ادارے پر کلہاڑا چلایا اور اس کی کمر توڑ دی ۔۔ مگر ضرب لگاتے وقت وہ اس عمل کے' مستقبل میں' رد عمل کو فراموش کر بیٹھے جو اب سب کی نظروں کے سامنے ہے۔ اب طلباء اگر قتل کرتے ہیں' ڈاکے ڈالتے ہیں' اغوا کی وار داتوں میں حصہ لیتے ہیں تو ہمیں حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔

ایوب خان کے خلاف' ایوب کے سابق وزیر ذوالفقار علی بھٹو نے طلباء کو استعمال کیا مگر یہ استعمال کلی نہ تھا' جزوی تھا۔ بھٹو نے ایوب کے زوال کو بروقت پہچانا اور اسے بروقت استعمال کرکے اپنے اقتدار کا راستہ صاف کیا۔ وہ لوگ جو بھٹو کی جمہوریت نوازی اور جمہوریت پسندی کی تعریف میں زمین' آسمان کے قلابے ملاتے ہیں' وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بھٹو نے ایوبی آمریت تلے جنم لیا تھا۔ اس کی ملازمت میں برسوں کام کیا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ بھٹو مرغ باد نما تھے۔ اصول پسندی اور وفاداری ان کی سرشت میں نہیں تھی۔ وہ ایک موقع پرست انسان تھے۔ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہوں گا کہ انہوں نے اقتدار کے حصول کے لئے طلباء' مزدوروں اور غریب عوام کے کندھوں کا استعمال کیا اور جب اقتدار انہیں مل گیا تو انہوں نے ان ہی کندھوں کو توڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تعلیمی اداروں میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن (پی ایس ایف) بنائی تاکہ مخالف جماعتوں کے طلبا ونگز کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ ان کا انتہائی خطرناک عمل تھا۔ تعلیمی اداروں میں اپنی جماعت بنا کر' ان کی سرکاری سرپرستی میں مخالفین پر دہشت طاری کرنے کا آغاز بھٹو نے کیا۔ موجودہ حکومت اگر ایم ایس ایف کی

سرپرستی فرما رہی ہے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اس نے یہ درس بھٹو کے اقدامات سے لیا۔

1963ء میں میں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کر لیا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی میں یہ اصول تھا کہ اگر کوئی طالب علم فرسٹ پوزیشن میں اپنے شعبے میں ایم اے کر لے' تو اسے آسامی کی موجودگی میں اسی شعبے میں بطور جونیر لیکچرار رکھ لیا جاتا تھا۔ میری چونکہ فرسٹ پوزیشن تھی' اس لئے مجھے بھی سندھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں ہی بطور جونیر لیکچرار ملازمت مل گئی۔ سات سال تک میں مسلسل اس یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا۔ خواہش تھی کہ ڈاکٹریٹ کرنے بیرون ملک جاؤں گا مگر یونیورسٹی کی سیاست نے میرا' اس وقت تک' خواب پورا نہ ہونے دیا۔ رضی الدین صدیقی صاحب کے چلے جانے کے بعد کراچی کے ایک وکیل حسن علی صاحب' سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن کر آئے۔ وہ تھوڑا عرصہ رہے اور پھر یونیورسٹی غلام مصطفیٰ شاہ صاحب کی وائس چانسلری کے قبضے میں آگئی۔ یہ وہی غلام مصطفیٰ شاہ ہیں جو بی بی بے نظیر بھٹو کے زمانہ اقتدار میں مرکزی وزیر تعلیم تھے۔ غلام مصطفیٰ شاہ سندھ کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے پاکستان میں اور بالخصوص سندھ میں تعلیمی اداروں اور تعلیم کا بیڑہ غرق کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ یہ پہلے ایس ایم کالج کے پرنسپل تھے۔ پھر ڈائریکٹر آف ایجوکیشن ہوئے اور پھر سندھ کی بدقسمتی کہ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔ ان کی حرکتوں کے پیش نظر میں کہا کرتا ہوں کہ اگر یہ صاحب وی سی کے بجائے سندھ کے کسی تھانے کے تھانے دار ہوتے تو زیادہ مناسب رہتا۔ یہ وائس چانسلر بن کر آئے تو آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ یونیورسٹی کے اندر سندھی اور غیر سندھی اساتذہ میں تفریق پیدا کی۔ اس سے پہلے یونیورسٹی میں سندھی اور غیر سندھی اساتذہ کی اصطلاح ہی موجود نہیں تھی' انہوں نے آکر یہ "کارنامہ" انجام دیا۔ آتے ہی انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خالصتا" سندھی اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔ پھر غیر سندھی اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔

1970ء میں ہماری یونیورسٹی میں بیرون ملک پی ایچ ڈی کرنے کی لئے بیس وظیفے آئے۔ وظیفہ حاصل کرنے کےلیے جو معیار مقرر کیا گیا تھا میں اس پر ہر لحاظ سے پورا اترتا تھا مگر غلام مصطفیٰ شاہ نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ انہی دنوں برٹش کونسل کی طرف سے مجھے لندن کے لئے وظیفے کی پیش کش ہوئی جو صرف اتنی تھی کہ لندن جانے آنے کے لئے جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست ان کے سپرد تھا۔ میں نے اس کے لئے وی سی صاحب کو درخواست دی تو انہوں نے میری درخواست آگے نہیں بھیجی۔ میں چپکا ہو رہا.... لیکن یہ سوچ ضرور غالب آگئی کہ اگر یہی

حالات رہے جن میں شدت کے زیادہ امکانات ہیں اور میں پی ایچ ڈی نہ کر سکا تو میں ساری عمر لیکچرر شپ کی پوسٹ پر ہی دھکے کھاتا رہوں گا' چنانچہ میں نے یونیورسٹی سے اپنا پراویڈنٹ فنڈ نکلوایا اور اپنے خرچ پر ڈاکٹریٹ کرنے لندن چلا گیا۔ خیال یہ تھا کہ وہاں کسی جگہ کام کروں گا اور تعلیم کے اخراجات پورے کر لوں گا۔

لندن پہنچا ہی تھا کہ برطانیہ میں ایک نیا تعلیمی قانون نافذ کر دیا گیا جس کے مطابق غیر ملکی طلباء کی ٹیوشن فیس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اس کی وجہ سے خاصا پریشان تھا۔ سارے منصوبے خاک میں ملتے نظر آ رہے تھے کہ ایک مخلص دوست نے مشورہ دیا' جرمنی کی یونیورسٹیوں میں ٹیوشن فیس نہیں ہوتی' تم وہاں چلے جاؤ۔ میں نے فوراً جرمنی کی تین چار یونیورسٹیوں میں اپلائی کر دیا۔ اس دوران میں لندن ہی میں رہا۔ تھوڑے دنوں بعد وہاں کی روہر (RUHR) یونیورسٹی سے مثبت اور حوصلہ افزا جواب آیا۔

یہ یونیورسٹی بوخم شہر میں واقع ہے۔ یہاں جرمنی کی اہم ترین صنعتیں قائم ہیں۔ یہ علاقہ اپنے کوئلے کی وجہ سے بھی بہت شہرت رکھتا ہے۔ جنگ عظیم اول میں انہی کانوں کے لالچ میں فرانس نے اس جگہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ جرمنی کے سب سے بڑے صنعتی خاندان کروپس کے کارخانے یہاں زیادہ ہیں۔ کروپس اور بادشاہ کے درمیان ایک معاہدہ کیا گیا تھا کہ اس علاقے میں کوئی تعلیمی ادارہ نہیں بنایا جائے گا کہ اگر یہاں کے لوگ تعلیم حاصل کر جائیں گے تو ان کے کارخانوں اور کانوں میں مزدوری کون کرے گا؟ بہت عرصے تک یہاں کوئی تعلیمی ادارہ معرض وجود میں نہ آ سکا۔ روہر یونیورسٹی کو اس علاقے کی پہلی یونیورسٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور جرمنی بھر میں اس کی ممتاز ترین حیثیت ہے کہ اس تعلیمی ادارے نے جرمنی کو کئی سائنس دان اور فلسفی دیئے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ تعمیر ہوئی۔ یہاں داخلہ مل گیا۔ اس دوران میں میں لندن میں کام کر کے کچھ رقم پس انداز کر چکا تھا' سوٹ کیس اٹھایا اور جرمنی روانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں یورپ کے لئے ویزے کی پابندیاں اتنی سخت نہیں تھیں۔

جرمنی پہنچا تو سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا' چنانچہ چھ ماہ کا کورس کیا اور جرمن زبان میں لکھنے' بولنے اور پڑھنے کی مہارت حاصل کر لی۔ پھر باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ جرمنی میں' جتنے سال رہا' معاشی مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس کے لئے خدا نے میرے لئے عجیب سبیل نکال دی۔ جرمن یونیورسٹیوں کے ہوسٹلوں میں طلباء کے الیکشن ہوتے ہیں۔ ہر ہوسٹل میں علیحدہ علیحدہ ٹیوٹر کے انتخابات ہوتے ہیں۔ جو جیت جائے اسے "ٹیوٹر" کا خطاب ملتا ہے اور اسے ہوسٹل میں مفت کمرے کے علاوہ دو سو مارک بطور وظیفہ دیے جاتے ہیں۔ میں

نے اپنے سابقہ یونین تجربات کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔ الیکشن میں حصہ لیا اور جیت گیا۔ یوں مجھے کمرہ بھی مفت مل گیا' اور دو سو مارک کا وظیفہ بھی۔
ٹیوٹر کے فرائض میں یہ بات نمایاں طور پر شامل ہے کہ وہ کلچرل ایکٹوٹیز کا انعقاد کرے۔ میں نے یہ فرائض یوں ادا کئے کہ پاکستان کی ثقافت و تعلیم پر متعدد لیکچرز کا اہتمام کیا اور انڈیا اور پاکستان کی فلمیں دکھائیں۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ مجھے معاشی تنجھٹوں سے چھٹکارا حاصل رہا۔ ایک سال گزرنے کے بعد ٹیوٹر شپ ختم ہونے کے بعد دو سو مارک وظیفے اور مفت کمرے کی سہولتیں ختم ہونے لگیں تو میں نے اپنے ایک استاد سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے بطور خاص مجھے اسی یونیورسٹی میں کام دلوا دیا جس کے عوض مجھے پانچ سو مارک ماہانہ ملنے لگے۔
جرمنی میں وہاں کے بڑے بڑے صنعتی ادارے اور سیاسی پارٹیاں یونیورسٹیوں کے بعض ذہین طلبا کو وظائف دیتے ہیں ان دنوں یہ وظیفہ آٹھ سو مارک ماہانہ ہوتا تھا میرے بعض تعلیمی معاملات کی بدولت مجھے یہ وظیفہ بھی ملنے گا۔ میرا یہ وظیفہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے جاری کیا گیا۔ یوں مجھے آٹھ سو مارک ماہانہ ملنے لگے تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے پیسے کہاں خرچ کروں۔ معاش کی طرف سے آزادی ملنے کے بعد میں بڑے اطمینان کے ساتھ پی ایچ ڈی کرنے میں لگ گیا۔ 1974ء میں والدین سے ملنے پاکستان آیا تو میری شادی کر دی گئی۔ میری بیگم اس وقت بی اے کر چکی تھیں۔ شادی کے بعد میں اہلیہ کو بھی اپنے ساتھ جرمنی لے گیا۔

پی ایچ ڈی میں میرے مقالے کا موضوع تھا: "مغل دربار اور اس کی رسومات"۔ یہ مقالہ اب کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔ جرمنی میں پی ایچ ڈی کا طریقہ خاصا مختلف ہے۔ جس مضمون میں آپ پی ایچ ڈی کرنے کی خواہش رکھتے ہیں' وہ تو لامحالہ منتخب کرنا ہی پڑتا ہے' مگر اس کے علاوہ بھی تین مزید مضامین پڑھنے پڑتے ہیں۔ یوں یہ کام خاصا دشوار اور طویل مدت پر محیط ہو جاتا ہے۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ دو مستند ترین پروفیسر' جنہیں وہاں ریفری کا نام دیا جاتا ہے' کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ وہ اگر اسے اوکے کر دیں تو پھر مقالے کو تمام طلباء اور پروفیسروں کے مطالعہ کے لئے فیکلٹی ہال کے درمیان رکھ دیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یونیورسٹی میں ایک سرکلر جاری کر دیا جاتا ہے کہ فلاں موضوع پر مقالہ فیکلٹی ہال میں اتنے دنوں کے لئے رکھا گیا ہے' خواہش مند حضرات اسے دیکھ سکتے ہیں۔ طلباء و اساتذہ بڑی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس پر اپنی اپنی آراء درج کر دیتے ہیں۔ پھر زبانی انٹرویو ہوتا ہے۔ ایک گھنٹہ میجر سبجکٹ پر اور آدھ آدھ گھنٹہ چھوٹے تین مضامین پر۔ اس

انٹرویو کے پندرہ منٹ بعد امیدواروں کو بلا کر کامیابی کی صورت میں، سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے۔ مگر پی ایچ ڈی کی ڈگری اس وقت دی جاتی ہے جب مقالہ شائع ہو جاتا ہے۔ جرمنی میں بہت سے ادارے ایسے ہیں جو ان مقالات کو بخوشی شائع کر دیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ زبانی انٹرویو کے تمام سوالات جوابات شعبے کی طرف سے ٹائپ کر کے فیکلٹی کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیے جاتے ہیں تاکہ طلباء اپنی استعداد، خواہ وہ جیسی بھی اور جتنی بھی ہو، اس سے انکار نہ کر سکیں۔ اگر طالب علم اپنے رزلٹ سے مطمئن نہ ہو تو وہ اپنے اساتذہ کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے جو ان کے لئے مخصوص ہے۔ ۱۹۷۵ء میں میں روہر (RUHR) یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر فارغ ہو گیا۔

جرمنی کی جس یونیورسٹی سے میں نے پی ایچ ڈی کی، وہاں کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں بھارت کے وزیٹنگ پروفیسر کام نہ کر رہے ہوں۔ جبکہ وہاں ایک بھی پاکستانی وزیٹنگ پروفیسر نہیں تھا۔ وہاں یونیورسٹی کے اگر سارے نہیں تو کم از کم نصف سے زائد اساتذہ اور طلباء بھارت سے بخوبی واقف تھے جبکہ پاکستان کا نام آتے ہی پوچھتے تھے کہ یہ کہاں ہے؟ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کو بیرون ملک اپنے وطن کے لئے نرم گوشہ پیدا کرنے اور وہاں کے لوگوں کو پاکستان کے لئے ہموار کرنے میں کتنی دلچسپی ہے۔ حب الوطنی اور پاکستانیت اور نظریہ پاکستان کا راگ الاپنے والوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ یہ بھی عجیب تماشہ رہا کہ میں چھ سال جرمنی میں رہا۔ باقاعدہ وہاں پاکستانی سفارت خانے میں آنا جانا رہا۔ اس دوران جتنے بھی پاکستانی سفیر نامزد ہو کر آئے، مجال ہے کسی کو جرمنی زبان پر عبور حاصل ہو۔ نتیجے میں یہ لوگ گونگے بن کر وہاں بیٹھے رہتے یا پھر اپنے رشتے داروں کو ویزے پر بلانے کا کام کرتے رہتے۔ میں نے اس دوران میں بہت کم مرتبہ پاکستانی سفارت خانے میں پاکستانی اخبار دیکھے۔ اس کے مقابلے میں بھارتی سفارت خانے میں بھارتی اخبارات اور جرائد باقاعدہ آتے اور وہاں تقسیم کئے جاتے تھے۔ ان کے جرمن زبان میں تراجم شائع کر کے فروخت بھی کئے جاتے اور مفت بھی تقسیم کئے جاتے۔ میں نے جب پاکستانی سفارت خانے سے یہ درخواست کی کہ مجھے پاکستان سے فلمیں منگوا کر دی جائیں، جن کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا، تو مجھے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ متعدد درخواستوں کے بعد چند فلمیں جو پاکستان سے منگوا کر میرے حوالے کی گئیں، وہ معیار کے اعتبار سے اس قدر گھٹیا اور پست تھیں کہ ان کی نمائش کے بعد مجھے فخر کے بجائے سبکی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے برعکس بھارتی سفارت خانہ نے جو فلمیں نمائش کے لئے پیش کیں، وہ بھارت کی ایوارڈ یافتہ تھیں اور بہترین، چن کر انہیں جرمنی بھجوایا گیا تھا۔ جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ انڈین فلموں نے بے انتہا رش لیا اور پاکستانی فلموں کی طرف ایک دن کے سوا' کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے بعد مجھے یہ ہمت نہ ہوئی کہ میں پاکستانی سفارت خانے کو کوئی زحمت دوں۔

جرمنی سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد میں واپس اپنی یونیورسٹی حیدر آباد میں آگیا۔ اس وقت اس کے وائس چانسلر شیخ ایاز تھے۔ وہی شیخ ایاز جو سندھی زبان کے معروف شاعر ہیں۔ میں نے ری جائن (REJOIN) کرنے کی درخواست دی تو انہوں نے مجھے رکھنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ طویل عرصہ باہر رہنے کے لئے میں نے اجازت نہیں لی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ اول تو میں سرکاری وظیفے پر نہیں گیا تھا' دوسرے یہ کہ میں بغیر تنخواہ کے چھٹی پر تھا' تیسرے یہ کہ مجھے کام کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹریٹ کرنی تھی اور چوتھی یہ کہ جس طرح کے حالات سے میں واپس آیا تھا' اسی طرح کے حالات میں آنے والے کئی دوسرے ساتھیوں کو آپ نے REJOINING کی اجازت مرحمت فرما دی ہے۔ میں نے ایسے اساتذہ کے نام بھی گنوائے۔ اس موضوع پر ہم دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ شیخ ایاز صاحب نے مجھ پر یہ الزام لگاتے ہوئے کہ مبارک علی نے مجھ سے بد کلامی اور بد تمیزی کی ہے' مجھے یونیورسٹی کی ملازمت سے سسپینڈ (SUSPEND) کر دیا۔ سسپینشن (SUSPENSION) کا یہ سلسلہ سال بھر چلتا رہا۔ بھٹو صاحب وزارت عظمٰی پر فائز تھے اور شیخ صاحب کے ان سے گہرے مراسم تھے۔ میرا کسی جگہ بس نہ چل رہا تھا کہ شیخ صاحب بڑے طاقتور تھے۔ پریشان تھا کہ میرے ایک سندھی دوست نے سندھ کے ایک صوبائی وزیر سے ملاقات کروائی۔ انہوں نے شیخ صاحب سے میری بحالی ملازمت کے لئے سفارش کر دی۔ مجھے شیخ صاحب نے بلایا اور فرمایا کہ تم معافی کی درخواست لکھو جس میں اقرار ہو کہ تم نے وی سی صاحب سے بدتمیزی کی تھی۔ اب معاف کرنے کی درخواست قبول کی جائے۔ میں نے انکار کر دیا کہ اگر معافی مانگ کر ہی جبکہ میرا قصور قطعی کوئی تھا ہی نہیں' ملازمت لینی تھی تو ایک سال تنگ دستی میں کیوں گزارتا؟ وی سی صاحب صوبائی وزیر صاحب کی وجہ سے دباؤ میں تھے' چنانچہ انہوں (شیخ ایاز صاحب) نے میرے دوستوں سے کہا' مبارک کو سمجھاؤ کہ معافی نامہ لکھ دے مگر میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ پھر شیخ صاحب نے ایک روز مجھے بلایا اور کہا کہ ایک درخواست لکھو جس میں یہ اندراج ہو کہ تمہیں جرمنی میں دیر کیوں ہوئی۔ میں نے اپنی پہلی والی داستان لکھ ڈالی۔ دوسرے روز سنڈیکیٹ کے اجلاس میں میری وہی درخواست ارکان سنڈیکیٹ کے سامنے لہراتے ہوئے وی سی صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر مبارک علی نے معافی نامہ لکھ دیا ہے' اس لئے اب میں انہیں بحال کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا

تو افسوس کے ساتھ میں ان کے پاس حاضر ہوا اور اس پر احتجاج کیا۔ وہ خاموش رہے۔ یوں میں دوبارہ یونیورسٹی سے منسلک ہو گیا۔

یونیورسٹی سے منسلک ہونے کے بعد مجھے تنخواہ ملنے لگی تو میں نے یونیورسٹی اور وی سی پر مقدمہ دائر کر دیا کہ انہوں نے میری ایک سال کی تنخواہیں روک رکھی ہیں جبکہ اصل قصور وار وی سی صاحب تھے۔ شیخ ایاز میرے اس مقدمے سے بڑے سیخ پا ہوئے۔ کہا: تم ہمیں بدنام کر رہے ہو۔

5 جولائی 1977ء کو جب جنرل ضیاء الحق نے شب خون کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کو معزول کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو شیخ ایاز کے طور اطوار بھی راتوں رات بدل گئے۔ شیخ ایاز صاحب جو نظریہ پاکستان کا استہزا اڑاتے تھے' دن رات نظریہ پاکستان کی مالا جپنے لگے۔ شیخ صاحب جو نماز روزے سے دور تھے' پانچوں وقت کے نمازی بن گئے۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کے کٹر مخالف شیخ صاحب' راتوں رات ہی تفہیم القرآن کا سندھی میں ترجمہ کرانے پر تیار ہو گئے۔ وہ اقبال پر شدید تنقید و تنقیص کرنے والوں میں شمار ہوتے تھے' اب کلام اقبال اور اقبال کی شخصیت کے گن گانے لگے۔ ان ہی دنوں شیخ صاحب نے صلاح الدین صاحب' جو اب "تکبیر" کے مدیر ہیں' کو اپنے گھر دعوت پر بلایا اور دوسرے روز انکی بھٹو مخالف یونیورسٹی میں مفت تقسیم کی' مولانا مودودیؒ کی کتابیں لائبریری میں شامل کر دی گئیں۔ یونیورسٹی کیمپس میں تعینات مارشل لاء کے ایک میجر کو یونیورسٹی کی گاڑی سونپ دی۔ ان حرکات سے یونیورسٹی بھر میں ان کے خلاف شدید رد عمل پیدا ہوا۔ سندھی قوم پرست اساتذہ اور طلباء لیڈر تو ان کے جانی دشمن بن گئے۔ ایک روز انہی اساتذہ اور طلباء نے سب کے سامنے ان کو بے عزت کیا۔ اپنی پہلی ٹرم پوری کرنے کے بعد شیخ صاحب کی کوشش تھی کہ ان کا دوبارہ سے تقرر ہو جائے مگر حکومت نے ان کی "کوششوں" کے باوجود انہیں مایوس ہی کیا۔

میں یونیورسٹی سے دوبارہ منسلک ہوا تو اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ پھر اسسٹنٹ پروفیسری سے فل پروفیسری تک بڑے جاں گداز مراحل میں سے گزرنا پڑا۔

جی ایم سید اور "سندھو دیش" کا ذکر آیا تو یہ بھی کہتا چلوں کہ جی ایم سید بہت کچھ ہونے کے باوجود سیاسی بصیرت سے عاری انسان ہیں۔ کسی زمانے میں یہ صاحب سندھ میں یہ تحریک چلائے ہوئے تھے اور دہلی اور لکھنؤ کے مسلمانوں سے اپیلیں کر رہے تھے کہ وہ سندھ آئیں اور انہیں سندھی ہندوؤں سے نجات دلائیں۔ اب یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ بھارت کے ہندو آئیں اور انہیں ایم کیو ایم سے نجات دلائیں۔ مگر ان کی صاف گوئی مجھے پسند ہے۔ ان کی

کتاب "پاکستان ٹوٹ جانا چاہئے" کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ ان کے اپنے جذبات کا تنور ہے۔ سیاست میں سید صاحب نے کنفیوژن پھیلایا ہے۔ اس کے باوجود ان کی بعض باتوں سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً میں ان کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ سندھ کے اردو بولنے والے طبقے کو اگر زندہ رہنا ہے تو انہیں سندھ' اہل سندھ اور سندھی کلچر کو قبول کرنا پڑے گا وگرنہ وہ معدوم ہو جائیں گے۔ میرا اس بات پر بھی یقین ہے اور میں سب کے سامنے اس ایقان کا اظہار کرتا ہوں کہ برصغیر کی جو تقسیم 47ء میں ہوئی' غیر فطری تھی۔ نظریہ پاکستان مصنوعی نعرہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر کی تقسیم نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا۔ نقصان ان معنوں میں کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی مجموعی قوت تقسیم ہو گئی' چنانچہ بھارت میں رہ جانے والے مسلمان اچھوتوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے اور پاکستان آنے والوں کو وہ دن دیکھنا آج تک نصیب نہ ہوا جس کے حصول کی خاطر نظریہ پاکستان کا نعرہ بلند کیا گیا تھا۔ بنگلہ دیش نے مسلم قومیت کے اس نعرے کو اور بھی زک پہنچایا' "نئے پاکستان" میں اب مسلم تشخص نہیں علاقائی اور نسلی تشخص ابھر رہا ہے۔ مسلم قومیت کی بنیاد پر ہم نے جو تجربہ کیا تھا' وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ چاہے اسے کوئی مانے یا اس کا انکار کرے' مگر یہ حقیقت کا دیو ہے۔ یہ تجربہ نہ صرف ہمارے ہاں ناکام ہوا بلکہ مشرق وسطیٰ کے اندر بھی ناکامی سے دوچار ہوا' وہاں مسلم قومیت اور مسلم تشخص کی تحریک کی ناکامی کے بعد عرب تشخص کا نام بلند کیا گیا۔ پھر یہ بھی ناکام ہو گیا۔ اب وہاں مصری' لبنانی' سعودی' لیبیائی اور کویتی تشخص کا نعرہ گونج رہا ہے۔ پاکستان کے اندر فوجی جنتا نے بار بار مارشل لاء نافذ کرکے خود نظریہ پاکستان کی تکذیب کی' اس کی حرمت کو پامال کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے تو رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ کیا آج تک کسی ایسے فوجی جرنیل کا کورٹ مارشل ہوا ہے' اسے قومی مجرم گردانا گیا ہے جس نے پاکستان سے غداری کی؟ جس نے پاکستان توڑنے والوں کا ساتھ دیا؟ جنرل نیازی ہی کا نام لے لیں' وہ تو صریح مجرم تھا۔ کیا سقوط ڈھاکہ کے جرم میں اس پر مقدمہ چلایا گیا؟ اسے اس لئے جرنیلوں نے معاف فرما دیا کہ اگر اسے کٹہرے میں لایا جاتا ہے تو پھر یہ ریت بن جائے گی اور اس کٹہرے میں پھر بڑے بڑے سربر آوردہ بے سر ہو جائیں گے۔ میں کسی تحفظ کے بغیر یہ بات کہتا ہوں کہ پاکستان بنتے وقت پاکستان کو فوج کی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر بقاء کی جنگ مشکوک تھی' اور آج فوج کو پاکستان کی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر فوج کا گزارہ نہیں۔ ہمارے ہاں احتساب کے غیر جانب دار ادارے کے نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں۔

مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ پاکستان کی بقا سیکولرازم سے وابستہ ہے۔ ہاں یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ سیکولرازم کا نعرہ پاکستان میں بلند کرنے سے نظریہ پاکستان باطل ثابت ہو جائے گا۔ تو میں اس ضمن میں یہ کہوں گا کہ ایک بار انسان سے جو غلطی سرزد ہو جائے' تو کیا ساری عمر اسی پر اصرار کرتے چلے جانا دانشمندی ہو گی؟۔

میں تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے یہ بات کہوں گا کہ جتنا نقصان بھٹو نے اس ملک کو پہنچایا' کوئی اور نہ پہنچا سکا۔ بھٹو ہی نے ملک میں بنیاد پرستی کی بنیاد رکھی۔ جمعہ کی چھٹی کرانا' قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا' اسلامی نظام کے نفاذ کی حامی بھرنا اور امام کعبہ کو سعودی عرب سے پاکستان بلا کر لوگوں کو اس کے پیچھے نمازیں پڑھانا بنیاد پرستی کے عوامل تھے۔

آخر یہ کیا بات ہے کہ جب بھی پاکستان میں کوئی نیا حکمران آتا ہے' کچھ عرصہ گزرنے کے بعد عوام یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس سے پہلے والا حکمران اس سے اچھا تھا؟ وجہ صاف ہے کہ ہر حکمران اپنے آپ سے مخلص تھا۔ نہیں تھا تو صرف اپنے عوام سے اور ملک سے! جنرل ضیاء الحق کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے دور کے جرائم گنے نہیں جا سکتے۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو میں کہوں گا کہ ضیاء الحق بھٹو سے بڑا قومی مجرم تھا۔ اور وہ 17 اگست کے حادثے میں انتقال نہ کر جاتے تو یقیناً یہاں ان کا کڑا احتساب ہوتا مگر خدا نے اس حادثے کے پردے میں ان کی تمام غلطیوں پر پردہ ڈال دیا۔ جو شخص گیارہ سال تک اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے دروغ گوئی سے کام لیتا رہے' اسے ایک غیر جانب دار شخص کیا قرار دے گا؟ افغانستان کے مسئلے کو انہوں نے خود الجھایا۔ جس روز انہوں نے بندوق کی نال سے مسئلہ افغانستان کو حل کرنے کا فیصلہ کیا تھا' یہ مسئلہ اسی روز الجھ گیا تھا۔ اگرچہ بھٹو صاحب بہت پہلے گلبدین حکمت یار کو کابل سے اپنے پاس اسی مقصد کے لئے بلا چکے تھے۔ افغانستان میں امریکہ کی شہ پا کر ہمیں کیا ملا؟ چالیس لاکھ افغان مہاجرین کا تحفہ؟ ہیروئن کی بوریاں؟ کلاشنکوف کلچر؟ سرحد اور بلوچستان میں ان افغان مہاجرین کی وجہ سے مرکز گریز قوتوں کی اٹھان؟ بلوچی اور سرحدی ثقافت کی بربادی؟ بے پناہ معاشی بد حالی؟ یہ مسئلہ دو ارنا بھینسوں کی لڑائی تھا جس میں پاکستان کو دانستہ گھاس کی طرح رگید ڈالا گیا۔ دراصل خمینی ایران میں آیا تو دنیا بھر کے شیعوں نے جارحانہ انداز میں سر اٹھانا شروع کر دیا۔ پاکستان میں بھی شیعہ کمیونٹی زیادہ ایکٹو ہو گئی۔ اس کی وفاداریاں ایران کے ساتھ ہیں۔ پاکستانی سیاست میں مولوی کو گھسیٹ کر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جنرل ضیاء صاحب نے جس طرح اس فضا کو آلودہ کیا' اس کے اثرات اب سب کے سامنے ہیں۔ اب یہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھے گا۔ جنرل ضیاء کا اسلام' سیاسی اسلام تھا'

اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے جمہوریت کو تین بار قتل کیا۔ ضیاء الحق کے اصل کردار پر میں یقیناً لکھوں گا۔ ابھی ان کے اصل کردار اور شخصیت پر تعصبات اور محبتوں کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ جب یہ گرد کوئی غیر جانبدار مورخ صاف کرے گا تو جو تصویر ابھرے گی' وہ یقیناً جنرل صاحب کے حق میں نعرے لگانے والوں کے لئے حیرت انگیز ہو گی۔

88ء میں جب بے نظیر اقتدار میں آئیں تو وہ کسی میرٹ کی بنیاد پر نہیں آئی تھیں۔ ان کا برسر اقتدار آنا فوج اور امریکہ کی ملی بھگت تھا جو بے نظیر کے ذریعے اپنے مقاصد پورے کرنا چاہتے تھے۔ پھر جب بے نظیر کے جیالوں نے لوٹ مار شروع کر دی تو اس سے بھی عوام میں فرسٹریشن پیدا ہوئی۔ بعد ازاں اعلیٰ قوتوں نے 6 اگست 1990ء کو ان کے ساتھ وہی سلوک PUPPET وزیر اعظم کے ساتھ کیا تھا... لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ 6 اگست کے اقدام نے بے نظیر کو بہ حیثیت سیاست داں تقویت دی ورنہ چند ماہ کے بعد عوام خود ان کو وزارت کی گدی سے دور پھینک دیتے۔ بے نظیر محدود صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ وہ دوبارہ برسراقتدار آ بھی جائیں تو زیادہ دن نہیں نکال سکیں گی۔ ان کے زوال میں مولوی فیلنر نے بھی مرکزی کردار ادا کیا۔

مجھ پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ میں دانستہ مغل ہسٹری کو ایک خاص آئینے میں دیکھ رہا ہوں اور لوگوں کو دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مغل ہسٹری' اسلامی تاریخ نہیں' اس لئے اس میں خیر اور تعمیر کے پہلو برائے نام ہیں۔ مغل تاریخ کو سیکولر تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اکبر نے پہلی بار انڈنیائزیشن کی تحریک شروع کی۔ اس کے مرنے کے بعد مغل دربار میں اسلام اور سیکولر طاقتیں باہم دست و گریباں ہو گئیں۔ اورنگزیب اور دوسرے مغل شہنشاہوں کے خلاف جتنی بھی تحریکوں اور بغاوتوں نے سر اٹھایا' یہ سب نیشنلسٹ تھیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت مغل پاور کی سنٹرلائزیشن تھی۔ ساری طاقت بادشاہ کے پاس تھی۔ مغل منصب داروں کا پورے ذرائع آمدنی اور طاقت کے سرچشموں پر قبضہ تھا۔ جب دوسروں کو اپنے جائز حقوق نہ ملے تو بغاوتوں نے جنم لیا۔ یہ قومی بغاوتیں تھیں۔ مغلوں نے انہیں اپنی سلطنت کے خلاف سمجھا اور انہیں بزور قوت کچلنے کے اقدامات کئے مگر وہ پوری طرح فرو نہ ہو سکیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال میں دیہاتوں نے اہم کردار ادا کیا۔ مغل بادشاہ اور منصب دار اپنی عیاشیوں اور سہولتوں کے لئے دیہاتوں سے ریونیو اکٹھا کرتے مگر اس کے بدلے میں دیہاتوں کو کچھ نہ ملا۔ نتیجے میں محرومیاں بڑھیں۔ میرا اپنا تجزیہ ہے کہ مغلوں کے خلاف جتنی بھی بغاوتوں اور تحریکوں نے سر اٹھایا' یہ سب دیہاتی زندگی کا شہری زندگی کے خلاف رد عمل تھا۔ ایک محروم طبقے کا ایک

مراعات یافتہ طبقے کے خلاف شدید ناراضگی کا عملی اظہار تھا۔ سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں اور راجپوتوں کی جتنی بغاوتیں تھیں، یہ سب اسی زمرے میں آتی ہیں مگر ہم نے تاریخ سے کوئی سبق نہ سیکھا۔ اب یہی حالات سندھ میں ہیں۔ سندھ کا دیہی طبقہ، شہری طبقے کے اسی لئے خلاف ہے کہ ایک محروم ہے اور دوسرا مراعات یافتہ ہے جبکہ سہولتوں کا مخزن فی الحقیقت گاؤں ہیں۔ یہ لہر اب پنجاب میں بھی سرایت کر رہی ہے اور آہستہ آہستہ سرحد اور بلوچستان کی طرف بھی منتقل ہو گی۔ مغل بادشاہوں کے دور میں انصاف نام کی کوئی شے نہیں تھی.... اگر تھی بھی تو انصاف دو طرح کا تھا۔ شاہی خاندان اور منصب داروں کے لئے نرم، غربا اور پست طبقے کے لئے عذاب کا کوڑا۔ اس امتیاز سے بھی مغل سلطنت کے خلاف نفرت کے جذبات نے جنم لیا جو ایک مقررہ مدت پر آتش فشاں کے لاوے کی طرح پھٹا اور ساری مغلیہ سلطنت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

میں نے ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ سب کا موضوع تاریخ ہے کہ میری پہچان یہی ہے۔ میری تصنیفات میں مغل دربار، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، تاریخ اور آگہی، تاریخ کے بدلتے نظریات، تاریخ کے نظریات، تاریخ اور فرقہ واریت، سندھ کی پہچان، علماء، معاشرہ اور جہاد تحریک کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں یہ کہوں گا کہ پاکستانی تاریخ دان درست اور OBJECTIVE تاریخ پیش نہیں کر رہے۔ ابتداء ہی میں ان کے سروں پر نظریہ پاکستان کا فوبیا قبضہ جما لیتا ہے، پھر اس کے بعد انہیں کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ جب تک پاکستان میں موجودہ نظام تعلیم جاری رہے گا، OBJECTIVE اور سیکولر مائنڈڈ ہسٹری پیش نہیں کی جا سکتی، درست اور صحیح تاریخ نویسی کے لئے ہمیں اپنے ذہنوں کو ہر قسم کے تعصبات کی آلائشوں سے پاک کرنا ہو گا۔

انٹرویو

(انٹرویو لینے والے: سہیل وڑائچ برائے روزنامہ جنگ)

"متنازعہ کتابوں کے متنازعہ مصنف" ڈاکٹر مبارک علی کی باتیں چونکا دینے والی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے مل کر تاریخ کا روایتی تصور ڈگمگا جاتا ہے۔ جرمنی سے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کے بعد وہ سندھ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ سے منسلک ہو گئے اور بعد ازاں صدر شعبہ کے عہدہ پر پہنچے۔ اب تک تاریخ کے مختلف موضوعات پر اردو اور انگریزی میں 20 کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ پانچ زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں اور ان دنوں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ریزیڈنٹ ڈائریکٹر کے عہدہ پر کام کر رہے ہیں۔ چند روز پہلے ان سے تاریخ' سیاست اور پاکستان کے حوالے سے ایک تفصیلی بات چیت ہوئی جس کی تفصیلات آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

جنگ ۔ ہمارے ہاں آج کل سب سے بڑا زیر بحث مسئلہ بنیاد پرستی ہے۔ آپ اس سلسلے میں بتائیں کہ اسلام کے اندر اور دوسرے مذاہب میں بنیاد پرستی کا تصور کب سے موجود ہے اور موجودہ دنیا میں اس کا کیا مستقبل ہے؟

ڈاکٹر مبارک ۔ بنیاد پرستی صرف اسلام میں ہی نہیں ہے بلکہ تقریباً ہر مذہب کے اندر ہے۔ بنیاد پرستی کے پیدا ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ ہر مذہب کا جو پہلا مرحلہ ہوتا ہے اس میں تمام تعلیمات بہت سیدھی سادھی اور آسان ہوتی ہیں۔ لوگوں کی سمجھ میں آتی ہیں۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد چونکہ کم ہوتی ہے اور جس طرح ہم کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دنوں میں اسلام کی خالص تعلیمات تھیں لیکن جب بھی کوئی مذہب پھیلتا ہے اور ایک قوم سے نکل کر دوسری قوم کے اندر جاتا ہے تو اس کے اندر دوسری تہذیبیں' ثقافتیں اور دوسری چیزیں بھی شامل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

یعنی اس کے ساتھ دوسری روایات اور تہوار وغیرہ بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔ جب اسلام میں فتوحات ہوئیں اور فتوحات کے نتیجے میں جب ایران اور شام فتح ہوئے تو اسی میں ایرانی تہذیب اور ثقافت کا اثر آنا شروع ہوا۔ اسی طرح جب شام فتح ہوا تو اس کے اندر بھی دوسری روایات آنا شروع ہوئیں۔ لہٰذا فتوحات کے نتیجے میں جب ایران اور شام فتح ہوئے تو اس کے اندر بھی دوسری روایات آنا شروع ہوئیں۔ لہٰذا فتوحات کے نتیجے میں یا مذاہب کی تبدیلی کے نتیجے میں جب ایک قوم دوسری قوم میں تبدیل ہوتی ہے تو وہ اپنے ساتھ اپنی روایات بھی ساتھ لے کر آتی ہے۔ اس میں کچھ چیزیں مذہب کی تبدیلی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن بہت سی چیزیں باقی رہتی ہیں جو ختم نہیں ہوتیں۔ تبدیلی کا یہ عمل چلتا رہا اور اسلام کے اندر دوسری اقوام آنا شروع ہوئیں تو یہ سب چیزیں اسلام کا حصہ بنتی چلی گئیں۔ جس کو ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں اگر دیکھا جائے تو بنیادی طور پر وہ عرب ثقافت تھی۔ ان تبدیلیوں سے اسلام کے بنیادی عقائد تو اپنی جگہ رہے لیکن ثقافتی طور پر نئی چیزیں آتی چلی گئیں۔ جس طرح ہندوستان کے رسم و رواج اور موسیقی وغیرہ بھی ہمارے ہاں آئیں یعنی تہوار وغیرہ تبدیل نہیں ہوتے بلکہ وہ کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتے ہیں۔

جنگ .... اسلام کے عقائد میں مختلف ثقافتوں کے اثر پر علماء کا ردعمل کیا تھا؟

ڈاکٹر مبارک .... علماء کے طبقے نے یہ محسوس کیا کہ ان کے اندر جو دوسری روایات داخل ہوتی ہیں۔ یہ اسلام کی خالص حیثیت کو خراب کرتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو آپ کو محسوس ہو گا کہ علماء کرام شروع سے ہی کہتے آرہے ہیں کہ اسلام کے اندر غیر اسلامی چیزیں آرہی ہیں اور ان کو کسی طریقے سے نکالنا چاہئے تاکہ اسلام کو خالص کیا جا سکے۔ اسی لئے اسلام کے اندر سب سے پہلے "بنیاد پرستی یا احیاء" کی تحریک امام حنبلؒ نے شروع کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایرانی اثر اسلام اور عرب ثقافت کو خراب کر رہا ہے۔ اسلئے اسے کسی طرح سے پاک کرنا چاہئے۔

جنگ .... آپ کی بات سے کیا یہ مراد لی جائے کہ ان علماء کا کہنا تھا کہ کلچر کے حوالے سے خالص اسلامی کلچر صرف عرب کلچر ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... جی ہاں! امام حنبلؒ نے بھی اس وقت دو تین چیزیں کہی تھیں جس طرح انہوں نے کہا تھا کہ خلافت صرف قریش کا حق ہے۔ دوسرا انہوں نے کہا تھا کہ عربوں کو برا نہیں کہنا چاہئے بلکہ ان کی عزت کرنی چاہئے اور اسلام کے حوالے سے ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہئے اور ان کی عزت اس لئے بھی کرنی چاہئے کہ اس سے ایرانی اثر بھی کم ہو گا۔

جنگ .... میرا خیال ہے کہ خلافت صرف قریش کے لئے مخصوص کرنے کا تصور ہر زمانے کے لئے نہیں ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... شروع سے ہی دو مختلف آراء رہی ہیں۔ کہ خلافت کا حق کس کو ہے۔ یعنی کچھ لوگوں کا تو یہی کہنا تھا کہ یہ صرف قریش کا حق ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا تعلق بھی بنو ہاشم سے رہا ہے اس تصور کے خلاف جو سب سے پہلے بغاوت کی تھی وہ خارجی بغاوت تھی۔ کیونکہ خارجیوں کا کہنا تھا کہ خلیفہ ہونے کا حق ہر کسی کو ہے۔

جنگ .... لیکن خارجیوں کے بارے میں بھی تو بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ خالصتاً" اسلام کے حامی تھے؟

ڈاکٹر مبارک .... خارجیوں کے عقائد میں بہت شدت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کو بھی خلافت کا حق حاصل ہے۔ یہی اختلاف تھا وگرنہ شدت کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو مسلمان نہیں مانتے تھے۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بنیاد پرستی اس وقت شروع ہوتی ہے جب دوسری چیزیں ثقافت اور روایات میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر یہ فطری چیزیں بن جاتی ہیں۔ اس زمانے میں امام حنبلؒ آئے۔ ان کے بعد امام تیمیہ کا زمانہ آتا ہے اس وقت عباسی خلافت ختم ہو چکی تھی یعنی اسلام کے اندر منگولوں کے حملوں سے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن چکی تھیں۔

پھر اس سے لوگوں کے اندر شخصیت پرستی یا مزاروں کو پوجنا وغیرہ کا تصور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لئے امام تیمیہ نے بھی امام حنبلؒ کی پیروی کی اور کہا کہ ہمیں قرآن کو اسی طریقے سے سمجھنا چاہئے جس طرح کہ اس میں بتایا گیا ہے اور باقی سب چیزوں کو ختم کر دینا چاہئے اور یہ وہی تحریک ہے جو بعد میں محمد بن عبدالوہاب نے حجاز کے اندر شروع کی۔ اس کی بنیاد بھی امام حنبلؒ کے نظریات کے مطابق تھی۔

جنگ .... اسلام کے اندر ایک دوسرا نقطہ نظر بھی ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور اسی نقطہ نظر کی اکثریت حامی تھی؟

ڈاکٹر مبارک .... بات یہ ہے کہ یہ جتنی بھی تحریکیں تھیں یہ خالصتاً" مذہب کے لئے تو نہیں تھیں بلکہ ان کے پیچھے سیاسی مقاصد بھی شامل تھے۔ مثلاً امام حنبلؒ کی جو تحریک تھی اس میں وہ یہ چاہتے تھے کہ ایرانی اقتدار اور اثر کو ختم کر کے عرب اقتدار کو واپس لایا جائے۔

اسی طرح دوسری تحریکوں میں بھی کچھ سیاسی مقاصد شامل تھے۔ امام تیمیہ بھی خالص اسلام کی تحریک کے داعی تھے اور بعد میں حجاز میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک بھی اسی نظریے

کی پیرو کار تھی۔

جنگ ... اس میں تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہوں کہ محمد بن عبدالوہاب اور امام تیمیہ کے بارے میں ایک چیز کا فرق ہے کہ امام تیمیہ اگرچہ اسلام میں خالص پن چاہتے تھے لیکن ان میں تصوف کا عنصر پایا جاتا تھا جبکہ محمد بن عبدالوہاب تصوف کے خلاف تھے؟

ڈاکٹر مبارک ... آپ کی بات ٹھیک ہے یہ تو اسی طرح ہے جس طرح ہندوستان میں احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کا تعلق ایک ہی سکول سے تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ بعد میں ان میں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ یعنی وقت کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ حالانکہ ایک ہی سکول سے تعلق ہوتا ہے لیکن چونکہ الگ الگ زمانے کے اندر ہوتے ہیں اور ان کے مسائل بھی الگ ہوتے ہیں اس لئے ان کے چیلنج کا جواب بھی بدل جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سب لوگ چاہتے تھے کہ اسلام کو دوبارہ سے اس کی اصل شکل میں آنا چاہئے۔ یہاں بھی اگر آپ دیکھیں تو ان کا تاریخ کے بارے میں نظریہ مختلف ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو اسلامی تاریخ کا نظریہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اسلام کے ابتدائی دنوں میں اسلام نے ایک مثالی معاشرہ قائم کر دیا تھا اس کے بعد تو جس طرح کہتے ہیں کہ تاریخ ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد ان کا کہنا ہے کہ بعد میں آنے والا جتنا زمانہ ہے وہ ان کو خراب کر رہا ہے۔ لہٰذا اب ہمارا کام یہ ہے جس طرح شبلی نعمانی کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی اس میں ہے کہ پیچھے کی طرف جایا جائے یعنی اس کے اندر جتنی بھی آلودگی کی ہے پھر سے اسے صاف کرکے اس کی اصل حالت میں لا دینا چاہئے۔

یعنی پیچھے کی طرف جانا ہی ہمارے لئے بہتر ہے۔ علماء کا یا بنیاد پرستوں کا تاریخ کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ تاریخ نے ایک مثالی معاشرہ تو قائم کر لیا تھا اور اس کے بعد کے وقت میں ہونے والی تبدیلی کو ہم ترقی نہیں کہیں گے بلکہ اسی نے مثالی معاشرے کو خراب کر دیا ہے۔ لہٰذا بنیاد پرستی کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ ہم نے مختلف اثرات کو صاف کرتے ہوئے پیچھے کی طرف جانا ہے اور اس کی اصل حالت میں اسے واپس کرنا ہے۔

جنگ ... لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا نقطہ نظر بھی تو ہو گا جو ظاہر ہے مختلف سیاسی حکومتوں کے لئے استحکام کا باعث بنتا رہا؟

ڈاکٹر مبارک .... جب خلیفہ اور بادشاہ ہوتے تھے تو ان کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً جب عباسی خلافت قائم ہوئی ہے تو اس کے تھوڑے ہی عرصے میں فتوحات تو ہو گئی تھیں لیکن لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے مسلمانوں کی زیادہ تعداد صرف شہروں کے اندر تھی باقی جتنے بھی دیہات تھے ان میں عیسائی اور یہودی آباد تھے۔ یعنی حکومت کرنے والوں کی

صرف مسلمانوں کے معاملات ہی طے نہیں کرنا ہوتے تھے بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی ملنا ہوتا تھا لیکن اگر وہ صرف مسلمانوں کو ہی ملتے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو دوسرا درجہ دیتے تو ان کے لئے حکومت کرنا بہت مشکل ہوتا۔ اس لئے عباسی دور کے زمانے میں جب انہوں نے دارالحکومت قائم کیا تو اس میں زیادہ تعداد عیسائیوں اور یہودیوں کی تھی جو ترجمہ کرتے تھے اور انہوں نے ان کو برابر کا درجہ دیا کیونکہ ان کی اپنی ضروریات ایسی تھیں کہ ان کو لبرل رہنا پڑتا تھا۔

جنگ .... آپ کی بات سے کیا یہ مراد لی جائے کہ انتہا پسندانہ نقطہ نظر کو پذیرائی نہیں ملی اور لبرل نقطہ نظر کامیاب ہوتا رہا؟

ڈاکٹر مبارک .... آپ کی بات صحیح ہے لیکن ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوا اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ حکومت کی اپنی ضروریات چونکہ مختلف ہوتی ہیں اور ان کو ایسا کرنا پڑتا ہے۔

جنگ ... لیکن مسلمان عوام کی اکثریت جو خلیفہ یا بادشاہ کو سپورٹ کرتے تھے انکے رول کے بارے میں تھوڑا سا بتائیں کہ خلفائے راشدینؓ کے بعد عوام کے رویے کیا رہے؟

ڈاکٹر مبارک .... اصل میں علماء کا جو شروع شروع میں جھگڑا ہوا ہے یعنی علماء اور نوکر شاہی کے درمیان جھگڑے کی ابتداء عباسی دور میں شروع ہوئی۔ اور اموی دور کے اندر علماء اس وقت تک سیاست سے الگ تھے کیونکہ اموی اس کے سخت خلاف تھے لہٰذا اسلام کے شروع میں جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی اس وقت بہت سے مذہبی عالموں کا خیال تھا کہ سیاست کے اندر پڑنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے۔ اس سے ہمیں الگ ہو جانا چاہئے۔ پھر ایک یہ بھی خیال تھا کہ سیاست اور مذہب کو الگ رکھا جائے تو اس لئے اس وقت کافی لوگ اپنے مذہبی معاملات اور تعلیمات میں مصروف ہو گئے اور سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ سیاست میں حصہ لینے کا موقع ان کو اس وقت ملا جب عباسی انقلاب آیا اور جب انقلاب آیا تو اس وقت علماء کی کوشش یہ تھی کہ خلیفہ کو شریعت کے ماتحت کیا جائے۔ عباسی چونکہ ایرانیوں کی مدد سے طاقت میں آئے تھے ان کی کوشش یہ تھی کہ خلیفہ شریعت کے ماتحت نہ ہو بلکہ ایرانیوں کی طرز کا بادشاہ بنا دیا جائے اور تمام پاورز اس کو دے دی جائیں لیکن علماء اس کے اندر ناکام رہے کیونکہ ایرانی بیورو کریٹس کے پاس پاور تھی وہ کامیاب رہے۔ اور علماء کو انہوں نے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد ہمارے ہاں بادشاہوں نے جو کام کیا اس میں انہوں نے علماء کو ریاستی ڈھانچے کے اندر ضم کرکے ان کا حصہ بنا دیا۔ مثلاً انہوں نے قاضی، صدر، شیخ الاسلام اور مفتی کے عہدے دیئے۔ یعنی وہ ایڈمنسٹریشن کا حصہ بن گئے۔ اب ایڈمنسٹریشن کا حصہ بننے کے بعد یہ

وہی کرتے تھے جو سلطان یا حکمران چاہتا تھا۔ تو ایک لحاظ سے انہوں نے علماء کے زور کو ختم کرنے کے لئے ریاست کے ڈھانچے کے اندر ڈھال دیا۔ اگر آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کے اندر علماء کو تھوڑے سے وقت کے لئے جو سیاسی طاقت ملی ہے وہ سوری خاندان کے دور میں ملی ہے۔ اس لئے اکبر کے زمانے میں جب ان علما نے اپنے اثر اور طاقت کو دکھانے کی کوشش کی تو اکبر نے ان علماء کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے تین طریقے اختیار کئے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ جن علماء نے اس کے خلاف کفر کے فتوے دیے تھے ان سب کو جیل میں ڈال دیا یا ان کو قتل کروایا۔ دوسرا جو علماء اس کے مخالف تھے ان سب کو اس نے ہندوستان کے مختلف دیہات میں قاضی وغیرہ بنا کر بکھیر دیا۔ تیسرا کام اس نے یہ کیا کہ ریاست کی طرف سے ان کو جاگیریں دی جاتی تھیں وہ جاگیریں اس نے خود انٹرویو لیکر ان لوگوں کو دیں جو ریاست کے وفادار تھے پھر جو دانشور تھے انکی ڈیوٹی یہ لگائی کہ وہ ان علماء پر نظر رکھیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر سے لے کر اورنگ زیب کے زمانے تک علماء کی سیاسی طاقت مغلیہ دور میں ختم ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب نے بھی علماء کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ وہ خود بھی مذہبی تھا لیکن اس نے ان علماء کو اس طرح استعمال کیا کہ جو اسے کام کرنا ہوتا تھا وہ ان سے فتوے لیتا تھا۔

جنگ .... علامہ اقبال نے تو اورنگ زیب عالمگیر کو ایک آئیڈیل مسلمان حکمران کے طور پر پیش کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... میں سمجھتا ہوں کہ اورنگ زیب نے مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لے استعمال کیا اور انہی کے ذریعے اپنے دشمنوں کا خاتمہ کرایا۔ علماء چونکہ ریاست کا حصہ بن گئے تھے لہٰذا اس کے بعد یہ جس طرح چاہتا تھا ان علماء کے ذریعے اپنے مفادات پورے کرتا تھا۔

جنگ .... اورنگ زیب عالمگیر کو یہ کریڈٹ بھی تو حاصل ہے کہ اس کے دور میں فقہ حنفیہ کی تشریحات پر مبنی فتاویٰ کی تدوین ہوئی؟

ڈاکٹر مبارک .... فقہ حنفیہ کی تدوین اپنی جگہ صحیح۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں کہ وہ علماء کو صرف اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا۔ علماء کی خود اپنی کوئی آواز نہیں تھی۔

جنگ .... بے شک اس میں اس کا اپنا مقصد شامل تھا لیکن اس سے اسلام کا احیاء بھی تو ہوا ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اورنگ زیب کے دور میں آپ بتائیں کہ اسلام کا احیاء کہاں ہوا ہے۔ اورنگ زیب کا دور تو ایسا دور ہے جس میں سب سے زیادہ انتشار

ہے۔ یعنی مرہٹوں اور سکھوں سے لڑائیاں۔ اسی طرح راجپوتوں اور جاٹوں کے درمیان بے شمار جھگڑے ہیں۔ اور سب سے زیادہ کرپشن بھی اسی دور میں ہوئی۔

جنگ ... کیسی کرپشن؟

ڈاکٹر مبارک ... کرپشن اس لحاظ سے کہ جو ان کے قاضی القضاۃ عبدالوہاب تھے ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ بہت رشوت لیتے تھے اور جب وہ مرے ہیں تو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی جائیداد چھوڑی جس میں تین لاکھ اشرفیاں تھیں اور اس کے علاوہ کافی جائیداد تھی۔ اس زمانے کے ہم عصر مورخ خافی خان نے اورنگ زیب کے قاضیوں کے بارے میں لکھا ہے اور اس کے بعد کے مورخوں نے بھی ان قاضیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ رشوت لیتے تھے اور غلط فیصلے کرتے تھے اور انتہائی بد دیانت تھے۔ چنانچہ اورنگ زیب کے اپنے وقت میں چونکہ علماء ریاست کا ایک حصہ تھے لہٰذا وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ رہتے تھے ان کے پاس دولت بھی بہت تھی۔

جنگ .... لیکن اس وقت تو ایجوکیشن بھی یہی تھی۔ درس نظامی ہی سپریم ایجوکیشن تھی چنانچہ جو دنیاوی عہدے تھے وہ بھی تو انہی مدارس سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو ملتے ہونگے؟

ڈاکٹر مبارک .... قطعاً" نہیں۔ دنیاوی عہدے ان سکولوں سے پڑھ کر حاصل نہیں کئے جاتے تھے مدرسے تو صرف علماء کے لئے تھے جو سیکولر تعلیم تھی وہ مدرسوں میں نہیں ہوتی تھی اور اس سسٹم کے لئے یونیورسٹی یا مدرسے نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اس کو ہم آج کل کے زمانے کے مطابق اپرنٹس شپ کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ درس نظامیہ بھی اس وقت اس قابل نہیں تھا کہ وہ اس وقت کے حالات کے مطابق چل سکتا۔ اس میں صرف ایسے علوم رکھے گئے تھے جن کا زمانے کے حالات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً جب دیوبند قائم ہوا ہے تو اس میں درس نظامیہ کو انہوں نے رکھا اور خاص بات یہ تھی کہ دیوبند کے اندر تاریخ' جغرافیہ اور اسلامی تاریخ بھی نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔

جنگ .... ہمارے ہاں فقہ حنفی کے دو نقطہ ہائے نظر موجود ہیں دیوبندی اور بریلوی دونوں مکاتب فکر کے ارتقاء پر تاریخی حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... اس قسم کی تحریکوں کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہئے کہ یہ کن مفادات کو پورا کر رہی ہیں۔ یعنی یہ تحریکیں پوری سوسائٹی کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ بلکہ یہ خاص گروہ یا لوگوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی دور کو نوآبادیاتی دور کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ہمارے معاشرے کا ڈھانچا ٹوٹ رہا تھا یہ اس وقت عبوری دور سے گزر رہا تھا اور پرانے علماء کا

اثر و رسوخ کم ہو رہا تھا۔

اس طرح پرانے تاجر طبقوں کا زور بھی ختم ہو رہا تھا۔ اگر آپ تاریخ پر غور کریں تو یہ دیکھیں کہ یہ تحریکیں کن جغرافیائی علاقوں میں شروع ہوئیں اور وہ کون سے علاقے تھے اور پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کون سے طبقے تھے جنہوں نے ان تحریکوں میں زیادہ دلچسپی سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اب بریلوی تحریک دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ یوپی کے ایک شہر میں زیادہ مشہور ہوئی۔ ان میں زیادہ تر وہ طبقات شامل تھے جو زیادہ تر ہنر مندوں کا طبقہ تھا۔ یعنی بریلوی کی تحریک کے متاثرین دراصل برطانوی سامراج کے آنے کی وجہ سے جو تبدیلیاں آئیں ان تبدیلیوں کی وجہ سے جو خلا تھا ان کو بریلویوں نے پورا کیا۔ جیسے جس طرح جولاہا کلاس تھی وہ نو آبادیاتی دور کے اندر متاثر تھی کیونکہ اس سے ان کا کاروبار ختم ہو گیا پھر ان کو معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان حالات سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ مزاروں پر جانا اور نیاز وغیرہ دینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے کوئی بھی مذہبی تحریک شروع ہوتی ہے یہ کسی کے خلاف نہیں تھی۔ بلکہ یہ اس سماجی ضرورت کو پورا کر رہی تھی جو کچھ طبقوں کے اندر نو آبادیاتی نظام کی تبدیلیوں کی وجہ سے پھیلا تھا۔

اسی طرح دیوبند کی تحریک تھی۔ پھر اس سے پہلے سر سید نے ہندوستان کے اندر پہلی مرتبہ اسلام کا ترقی پسند نظریہ دیا۔ یعنی جو ترقی ہو رہی ہے اسلام سے اس کا کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ اسلام ترقی پسند چیزوں کو قبول کرنیکی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا یہ ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ یعنی نو آبادیاتی دور کی مخالفت کے جذبات صرف دیوبند علماء کے اندر ہی موجود نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی اپر کلاس کے لوگوں کے جذبات بھی اس طرح کے تھے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ جو نیشنلسٹ تحریکیں تھیں اس کے اندر انہوں نے حصہ لیا یعنی مڈل کلاس کے لوگوں کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے۔

جنگ ..... اس کے علاوہ دوسری تحریکیں بھی اپنا اثر دکھاتی رہی ہیں سب سے بڑی تحریک تو صوفیاء کی ہے ان میں سے بہت لوگ "انٹی اسٹیبلشمنٹ" بھی نظر آتے ہیں۔ یہ انٹی ملا بھی تھے انہوں نے اسلام کے پھیلانے میں بھی اہم رول ادا کیا؟

ڈاکٹر مبارک ..... اصل میں علماء اور صوفیاء میں اختلاف رہا ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں علماء ریاستی ڈھانچے کا ایک حصہ تھے لیکن صوفی نہیں تھے انہوں نے اپنے آپ کو الگ رکھا اور ایک لحاظ سے انہوں نے سیاست کے اندر دخل نہیں دیا سوائے ایک آدھ سلسلے کے جو کہ سہروردیہ کا سلسلہ تھا۔ باقی دوسرے سلسلے بالکل علیحدہ رہے۔ اسلام کے بارے میں جو

علماء کا نقطہ نظر ہے وہ شریعت کا ایک نقطہ نظر ہے جس میں پابندیاں ہیں۔ یعنی آپ نے اگر ارکان دین کی ذرا بھی پابندی نہیں کی تو آپ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاں تو تشدد ہے، سختی ہے اور وہ سب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے نقطہ نظر پر چلیں۔ اور جب علماء کو موقع ملا تو انہوں نے کوشش کی کہ ریاست کے تعاون کے ساتھ شریعت کے نفاذ کے لئے سختی کی جائے۔ جہاں ان کو موقع ملا انہوں نے بہت سے مذہبی فرقوں کے خلاف ریاست کی طرف سے سختی کی۔ شریعت کی سختی اور تشدد لوگوں کو پسند نہیں تھا اس کے مقابلے میں صوفیاء کا اسلام کے بارے میں جو نظریہ تھا اس میں سختیاں نہیں تھیں بلکہ اس کے اندر گنجائش تھی کہ آپ لبرل ماحول میں رہتے ہوئے بھی مسلمان رہ سکتے ہیں یعنی علماء کا شریعت اور صوفیاء کا طریقت تھا۔ اور صوفیاء کے طریقت کو لوگ زیادہ پسند کرتے رہے ہیں اور ملا کو حقارت سے دیکھتے رہے ہیں۔

جنگ .... لیکن اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علماء کا رول بہت بڑھ گیا ہے اور ان کے اثر و رسوخ میں بھی اضافہ ہو گیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... نہیں ابھی بھی وہ پاپولر نہیں ہیں۔ ایک بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ علماء کو عزت اور طاقت اس وقت ملتی ہے جب ریاست ان کی حمایت کرتی ہے لیکن اگر ریاست آج ان کی حمایت نہ کرے تو آج ہی ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔

جنگ .... لیکن پھر 77ء اور 53ء کی تحریک ختم نبوت کو آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر مبارک .... 77ء کی تحریک میں صرف علماء ہی شامل نہیں تھے۔ بات یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ عوام ان کے ساتھ تھے تو سب عوام ان کے ساتھ نہیں تھے یہ ضرور ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں لیکن زیادہ تعداد ان کے ساتھ نہیں ہوتی۔

جنگ .... آپ کی نظر میں پاکستان میں بنیاد پرستی کی بنیاد کس نے رکھی؟

ڈاکٹر مبارک .... پاکستان کے اندر بنیاد پرستی کی بنیاد ذوالفقار علی بھٹو نے رکھی تھی۔

جنگ .... وہ کیسے؟ ہم نے تو آج تک یہی سنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد علماء کی پہلی تحریک ختم نبوت تھی اور بعض حلقے یہ الزام لگاتے ہیں اس تحریک کے پیچھے وفاقی اور صوبائی حکومت کی کشمکش بھی تھی؟

ڈاکٹر مبارک .... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بھٹو سے پہلے ریاست کے اندر علماء کو سرپرستی حاصل نہیں تھی لیکن بھٹو نے آکر ان کی سرپرستی کی۔ اس سے پہلے مذہبی امور کی وزارت نہیں تھی لیکن بھٹو نے آکر مذہبی امور کی وزارت قائم کی۔ پھر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا

گیا۔ جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل کروائی اور شراب نوشی پر پابندی بھی اس زمانے میں لگائی گئی۔ اسی زمانے میں امام کعبہ کو بلایا گیا۔ اسلامی کانفرنس وغیرہ یہ سب اسی دور میں ہوا ہے۔ بھٹو کو مورد الزام اس لئے ٹھہراتا ہوں کہ انہوں نے ریاست کا سہارا علماء کو دیا تھا۔ اس سے پہلے ریاست کی طرف سے یہ سہارا ان کو نہیں ملا تھا۔ اسی لئے ضیاء الحق نے اسے پورے طریقے سے استعمال کیا۔ کیونکہ اسے یہ سب چیزیں بنی بنائی مل گئی تھیں اس نے ان سے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھایا لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج تک جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں ان میں مذہبی جماعتیں کبھی بھی بھاری تعداد میں کامیاب نہیں ہوئیں اس سے ہمیں عوام کے رجحان کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے آج بھی اگر ریاست کی طرف سے ان سے ہاتھ اٹھا لئے جائیں تو ان کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔

جنگ .... جنرل حمید گل اور کئی دانشور ان دنوں دنیا بھر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی بات کر رہے ہیں؟ تاریخ کے حوالے سے کیا ایک عظیم اسلامی سلطنت یا اسلامی بلاک کے قیام کا امکان ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... بظاہر تو تمام قرائن اس نظریہ کے خلاف ہیں۔ اس نظریہ میں بنیادی حیثیت روس سے آزاد ہونے والی وسط ایشیا کی ریاستوں کی ہے لیکن میرے خیال میں وہ مغرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور اسلامی بلاک بنانے پر شاید کوئی بھی ملک تیار نہ ہو۔

جنگ .... آپ سندھ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تاریخ رہے' سندھ میں پڑھتے رہے' سندھ کے مسئلہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مبارک .... پاکستان بننے کے بعد جو سندھ کے اندر تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ ہجرت کرنے والے بہت سے لوگوں کی تعداد سندھ میں آباد ہوئی اور جب ہجرت کرکے اتنے زیادہ لوگ آئے تو مسائل پیدا ہوئے۔ اندرون سندھ آکر جو لوگ آباد ہوئے تھے وہ ایک لحاظ سے سندھی معاشرے میں ضم ہو گئے تھے اور سندھی زبان اور ثقافت میں ڈھل گئے تھے۔ شہروں کے اندر یہ بات نہیں تھی۔ شہروں کے اندر چونکہ سندھی تعداد کم تھی اس لئے یہاں سندھی ثقافت زیادہ عام نہیں ہوئی اور خاص طور پر کراچی میں تو بالکل بھی ایسی بات نہیں ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں خود سکول میں سندھی زبان پڑھتا تھا پھر جب 58ء کا مارشل لاء لگا اور نکاخان مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کے آئے تو انہوں نے کہا کل سے سندھی نہیں پڑھائی جائے گی۔ سندھی زبان اس طرح سے ختم ہوئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ختم نہیں ہوتی تو جھگڑے نہ ہوتے۔ آج کل بھی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے لیکن جھگڑے اب بھی ہیں

لیکن میرے خیال میں ہمارے ملک میں اگر سیاسی عمل جاری رہتا اور اس میں لوگوں کا حصہ رہتا تو شاید یہ جھگڑے اتنے زیادہ نہ ہوتے جتنے اب ہو رہے ہیں۔۔ لیکن اس وقت کا جو ملٹری آپریشن ہے اس کے بارے میں' میں کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ فوج سندھ کے اندر جو کام کر رہی ہے اسے کہنا چاہئے کہ وہ سندھ کو الگ کرنے کے عمل کو تیز کر رہی ہے۔ مثلاً میں چند روز پہلے جب سندھ میں گیا تو لوگوں نے بتایا کہ شہروں کے اندر ایم کیو ایم اور اندرون سندھ میں سندھی لوگوں کو گرفتار کر کے لے جایا جا رہا ہے اور آرمی کے اپنے بھی ٹارچر سیل ہیں۔ وہاں آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ بہت سے لوگوں کی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ پھر لوگوں کو ذلیل کرنے کا سلسلہ شہروں اور دیہاتوں کے اندر مسلسل ہو رہا ہے۔ بسوں سے لوگوں کو اتار کر مرغا بنا دیا جاتا ہے اور گھسیٹ کر چلایا جاتا ہے پھر انہیں گالیاں دی جاتی ہیں۔ اس سے کرپشن بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے کہ کسی آدمی کو پکڑ کر اس کے گھر والوں کو کہا جاتا ہے کہ پیسے دے کر اپنا آدمی چھڑوا لو تو اس سارے عمل سے آگے چل کر نظر آتا ہے کہ بہت بڑا نقصان ہو گا۔

جنگ .... مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا فوری سبب آپ کی نظر میں کیا تھا؟ کیا بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ درست تھا؟

ڈاکٹر مبارک .... مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کسی حد تک بھٹو کا بھی ہاتھ تھا جو کچھ پہلے ہو رہا تھا ملٹری ایکشن نے وہ رد عمل اور بھی تیز کر دیا تھا۔ جہاں تک پھانسی کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ ایک لحاظ سے غلط تھا۔ بھٹو نے ضرور بہت سی غلطیاں کی تھیں لیکن ان غلطیوں کو عوام خود پکڑ سکتی تھی لیکن ان کی پھانسی کا فیصلہ غلط تھا۔

جنگ .... تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بارے میں بعض لوگ معاشی وجہ بیان کرتے ہیں بعض پاکستان میں اسلام کے نفاذ کو وجہ بیان کرتے ہیں آپ تقسیم ہند کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک .... یہ ہمارے حق میں زیادہ بہتر ہوتا اگر تقسیم ہند نہ ہوتی کیونکہ اس سے مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور اگر ایک جگہ ہوتے تو اتنے جھگڑے بھی نہ ہوتے۔

جنگ .... اگر یہ تقسیم نہ ہوتی تو مسلمانوں کو کبھی حق حکمرانی نہ ملتا' ملازمتیں نہ ملتیں اور ہم ہندو اکثریت کے تحت زندگی گزارتے؟

ڈاکٹر مبارک .... لیکن پھر ہندوستان میں ہندوؤں کی ایسی اکثریت کا رول زیادہ ہوتا جو سیکولر

ہوتی اور جب کوئی سیکولر ہندو حکومت ہوتی تو اس سے زیادہ نقصان بھی نہ ہوتا' باقی رہی ملازمتوں کی بات تو کیا پاکستان مختلف لوگوں کو جرنیل اور افسر بنانے کے لئے بنا تھا۔

جنگ ... بحیثیت تاریخ دان آپ سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں کہ پنجاب کے حالات میں وہ ایسی کیا بات تھی کہ یہاں کے لوگ حملہ آوروں سے مقابلہ نہیں کرتے تھے؟

ڈاکٹر مبارک .... آپ کو پتا ہے کہ جب یہاں غزنوی آئے تو انہوں نے پنجاب کو اپنے علاقے کا ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا پھر ایک عرصے تک پنجاب غزنوی سلطنت کا حصہ رہا۔ اس کے بعد جتنے لوگ بھی آئے ان کو موقع نہیں دیا گیا ہندوستان میں پنجاب کا جو علاقہ ہے یہ وہ علاقہ تھا جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے جو بھی حملہ آور آئے وہ مسلمان ہی تھے اس لئے ان کو ان سے لڑنے کا اتنا مسئلہ درپیش نہیں ہوا۔

جنگ .... پنجاب کے لوگ کب زیادہ تعداد میں مسلمان ہوئے؟

ڈاکٹر مبارک .... یہ عمل آہستہ آہستہ غزنوی دور سے شروع ہوا تھا اور پنجاب ایسا علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی زیادہ تعداد مسلمان ہوئی۔

جنگ .... پنجاب پر ایک اور اعتراض عام ہے کہ پنجاب کے پاس کوئی ہیروز بھی نہیں ہیں؟

ڈاکٹر مبارک .... اس کے بارے بریخت نے اپنے ڈرامہ گلیلیو میں لکھا ہے کہ کسی نے گلیلیو سے پوچھا کہ ہم بڑے بد قسمت ہیں کہ ہمارے ہاں کوئی ہیرو نہیں ہے تو اس نے کہا کہ وہ قومیں بڑی بد قسمت ہوتی ہیں جن کو ہیروز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں ہیروز کی ضرورت نہیں ہے ہیرو کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک شخصیت بنالی اور آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلنے لگے۔ ہیروز کا پیدا کرنا تو خود اپنی ترقی میں رکاوٹ کھڑی کرنا ہے۔